آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اپریل 2024

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

ادار یہ

مشعل	مدیر	4

جہانِ نسواں

پار پرے، اندھیرے موسم کی ایک روشن شام	ڈاکٹر ترنم جبیں	5
اکیسویں صدی کی اہم خواتین کے سفر ناموں کا مجموعی جائزہ	ڈاکٹر عدیلہ جسیم	12
تانیثیت اور اردو افسانہ	ڈاکٹر شہناز یوسف	19
خواتین کی بااختیاری اور سماجی ترقی میں تعلیم کی اہمیت	ڈاکٹر شبیر احمد	24
آزادی کے بعد گورکھپور کا ادبی ماحول	تسنیم قمر	27
عشرت ظفر: ''شرارِ سنگ'' کے آئینہ میں	مریم مختار	31
اردو شاعری میں دیوالی	فرزانہ اسد	36
شیخ جمالی کا تعارف	اختر النساء	39
اسماعیل میرٹھی کی نظم ''ہماری گائے'' ایک مطالعہ	صدف پرویز	42

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار		46

افسانہ

حسرتیں	ڈاکٹر نسرین بیگم	47
پھانس	سیدہ تبسم منظور ناڈکر	51
بے آواز تھپڑ	ذاکرہ شبنم	54

حسن سخن

ڈاکٹر سیدہ تفسیر فاطمہ، شاہین انجم شفی، سائرہ عظیم		57

صحت

یرقان اور امراض طحال	حکیم محمد اکبر	59

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:8 شمارہ:4 اپریل 2024

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

زبان ترسیل کا اہم ذریعہ ہوتی ہے۔خواتین کو اپنی زبان سے بیحد محبت ہوتی ہے اور وہ اس کے تئیں بہت حساس بھی ہوتی ہیں۔اس لیے خواتین نئے نئے محاورے وضع کر لیتی ہیں اور پھر عام بول چال کی زبان میں ان کو استعمال کرتی ہیں۔
عورتوں کی زبان کے معاملے میں نمایاں خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں لطیف الفاظ استعمال کرتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں عام بول چال میں اپنی بات کو مکمل کرنے میں دسترس رکھتی ہیں۔
زبان کی خوبصورتی اس کی سلاست اور روانی میں ہوتی ہے۔محاورے بھی ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہوتے ہیں۔ان کے ذریعے معاشرے کے تجربات اور تصوارت کی عکاسی ہوتی ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان کا استعمال ناگزیر ہے۔خواتین کی زبان سے متعلق اہم خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ خواتین معیوب سمجھی جانے والی باتوں کو بھی اشارے کنائے کے پردے میں بیان کرنے میں ملکہ رکھتی ہیں۔ متعدد محاورے عورتوں نے مختلف حالات کو ظاہر کرنے کے لیے بنائے اور اُن کے چلن کو عام کیا۔

خواتین اپنے اطراف کے ماحول سے بہت متاثر ہوتی ہیں اور گرد و پیش کے الفاظ سے عام اور سہل الفاظ کا انتخاب اس طرح کرتی ہیں کہ ان کو جزئیات کو پیش کرنے کے لیے الفاظ کی کمی نہیں ہوتی۔مردوں کے بجائے عورتوں کی زبان زیادہ عام فہم اور صاف اور شستہ ہوتی ہے۔عورتیں لسانی اعتبار سے بھی محاروں کو وضع کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔خواتین زبان سے شغف رکھتی ہیں اور زبان کو سیکھنے کا شوق ان کے اندر بہت ہوتا ہے۔وہ اپنے الفاظ کو گڑھنے کا ہنر جانتی ہیں اور ان کو محاورے میں کس طرح استعمال کرنا ہے اس ہنر سے بھی وہ واقفیت رکھتی ہیں۔نئی نئی اصطلاحیں وضع کرنا ان کے لیے بہت آسان ہوتا ہے۔

اردو کے بہت ادیبوں نے محاورے پر بہت کام کیا۔سید ضمیر حسن دہلوی کی باقاعدہ اس موضوع پر کتاب بھی موجود ہے۔ ہر زبان کی لغت میں ایسی فرہنگ موجود ہوتی ہے جو عورتوں کی بول چال کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔خواتین کی گفتگو میں جو الفاظ نظر آتے ہیں وہ مرد سے کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔محاورے سے مراد وہ کلام لیا جاتا ہے جس کا تعلق زبان یا اس زبان کے بولنے والوں سے لیا جاتا ہے۔خواتین کی بول چال میں کبھی کبھی بیگماتی زبان کا اثر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔اُردو نثر میں عورتوں کی بول چال میں داستانوی اسلوب بھی نظر آتا ہے۔

محاورات اور ضرب الامثال پر اردو میں متعدد کتابیں اور فرہنگ موجود ہیں۔اس کا سب سے اہم رشتہ لسانیات سے بھی ہوتا ہے۔عوامی سطح پر بھی محاورہ ایک طرح کی شعوری کوشش ہوتی ہے۔محاورہ وقت کے ساتھ ساتھ سینہ بہ سینہ نئی نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔

محاوروں میں ہماری پوری تہذیب جھلکتی ہے۔اس عہد کے حالات و واقعات ان محاوروں میں خوب نظر آتے ہیں جب وہ وضع کیے گئے ہوتے ہیں۔ہمیں محاوروں کو محفوظ کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہیے۔ہم اردو محاورات کو لسانی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں ان پر مزید تحقیقی کام کر کے اپنے تہذیبی ورثے کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

آپ کا

شمس اقبال

ڈاکٹر ترنم جبیں

پار پرے

اندھیرے موسم کی ایک روشن شام

اردو فکشن کا ذکر ہو اور جوگندر پال کا نام نہ آئے، کم از کم میری دانست میں یہ ناممکن ہے۔ جوگندر پال کی اردو میں 24 تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بہت سے افسانوں اور ناولوں کا ترجمہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں مثلاً ہندی، پنجابی، مرہٹی، تیلگو اور ملیالم میں متعدد افسانوں اور کئی ناولوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے ناول ''نادید'' کا ماسکو سے روسی زبان میں اور ناول ''خواب رو'' کا دہلی سے انگریزی میں ''Sleepwalker'' کے نام سے 1998 میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کہانیوں کے ترجمے عربی زبان میں بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں میری گفتگو کا موضوع ان کے ناول ''پار پرے'' کا فنی و موضوعاتی مطالعہ ہے۔

جوگندر پال کے ناول ''پار پرے'' کے موضوع اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے قبل دنیا کے سب سے عظیم ناول نگار لیو ٹالسٹائی (1828۔1910) جس کا نام اس کے دو ناولوں ''وار اینڈ پیس'' اور ''اینا کرینیا'' کی وجہ سے عالمی ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا، کے ان خیالات کا اعادہ ضروری سمجھتی ہوں جو انہوں نے اپنے مضمون ''فن کیا ہے؟'' میں کہا ہے۔ یہ مضمون 1888 میں شائع ہوا اور اس کا اردو ترجمہ اردو کے مایہ ناز ناقد ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے۔

لیو ٹالسٹائی لکھتے ہیں:

''ہمارے معاشرے میں فن اس قدر غلط راہ پر لگ گیا ہے کہ نہ صرف خراب فن اچھا سمجھا جانے لگا ہے بلکہ فن کا حقیقی تصور ہی غائب ہو گیا ہے۔ اس لیے اپنے معاشرے کے فن پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ فن کو ''جھوٹے فن'' سے

ممتاز کیا جائے۔

سچے فن کو جھوٹے فن سے الگ کرنے کے لیے یہ دیکھا جائے کہ آیا'' روح کے اندر اتر جانے والی اثر آفرینی'' (Infectiousness) موجود ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص (بغیر کوشش کئے اور بغیر اپنا نقطۂ نظر بدلے) دوسرے شخص کے فن کو پڑھ کر، سن کر یا دیکھ کر ایسی ذہنیت یا کیفیت کا تجربہ کرتا ہے جو اسے دوسرے شخص (فنکار) سے متحد کر دیتا ہے اور ساتھ ساتھ ان دوسرے آدمیوں سے بھی جو اسی سطح پر اس فن پارے سے متحد ہو گئے ہیں۔ جو شئے یہ کیفیت پیدا کرے وہ فن پارہ کہلائے گی۔ ایک کارنامہ خواہ کتنا ہی شاعرانہ، واقعاتی، موثر یا دلچسپ ہو فن پارہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ اگر وہ یہ احساس مسرت (دوسرے تمام احساسات سے قطعی ممتاز) پیدا نہ کرے اور مصنف سے روحانی لگاؤ پیدا نہ کرے اور ساتھ ساتھ ان دوسروں سے بھی جو اس فن پارے کی اثر آفرینی سے متاثر ہوتے ہیں۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2012، ص 449)

مذکورہ بالا اقتباس میں جس شئے کا ذکر کیا گیا ہے اور جس احساس مسرت کی بات کی گئی ہے، وہ ایک ایسی مسرت ہے جو دوسرے تمام احساسات سے قطعی ممتاز ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ قاری کے مصنف کے ساتھ جس روحانی لگاؤ پر گفتگو ہوئی ہے، یہ سب چیزیں احساس مسرت اور روحانی لگاؤ وغیرہ ناول'' پار پرے'' میں موجود ہیں۔ ناول پڑھتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہی شئے ہے اور یہ وہی احساس مسرت ہے، جس کا ذکر ٹالسٹائی نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں کیا ہے۔'' پار پرے'' ناول پڑھنے کے بعد پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جوگندر پال کے اس ناول'' پار پرے'' میں ایک روحانی عنصر چھپا ہوا ہے۔ اس بات کی دلیل کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایسا کیوں، جالمے؟ لالو اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔'' تم اپنے رب کے گن اس طرح گاتے ہو جیسے وہ تمہارا مالک ہو اور اس سے لڑتے جھگڑتے اس طرح ہو جیسے وہ تمہارا بڑا پکا یار دوست ہو۔''

''اوئے لالو، وہ میرا مالک تو ہے ہی ___ وہ سارے سنسار کا مالک اے، پر سچ پچھو، تو وہ ہے اپنا یار پادشاہ ہی، پچھو کیاؤں ___ اور بتاؤ مجھے، کیا اسے میرے واہگورو کا جی جگرا نہ مانو گے؟ ایدھر مجھے کالے پانی کی سجا ہوئی، ادھر وہ میرے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور اڑ گیا کہ جالما۔ میں بھی تمہارے سنگ جاؤں گا۔

اس کی آنکھوں کو بادلوں کا سایہ ڈھانپنے لگا۔

'' تم پچھتے ہو لالو، اپنے سنگ میں واہگورو کو بھی سجا بھگتنے کیاؤں لے آیا؟ اوئے میں نے تو اسکو لکھ سمجھایا، میرے سنگ تم بھی کیوں مرتے ہو بھلے لوک؟ پر جو کسی کی سن لے وہ رب ہی کیا؟ پھر بھی ایک بات تو مان گیا بھراوا۔ امیر کا رب تو لڈو پیڑوں کی نگرانی میں سویا پڑا رہتا ائے، پر بہناں۔'' اس نے گوراں کو بھی اپنی دلیل میں شامل کر لینا چاہا ___ '' گریب کا سائیں وکھت آنے پر اس کے ساتھ پھانسی پر بھی چڑھ جاتا ہے۔'' جالم سنگھ کے دل و دماغ میں گھنگھور گھٹا ہونے لگی اور اس کے بھٹکے بھٹکے وچار چھت کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔''

(جوگندر پال، پار پرے، انشاء پبلی کیشنز، کولکاتہ 2004، ص 29)

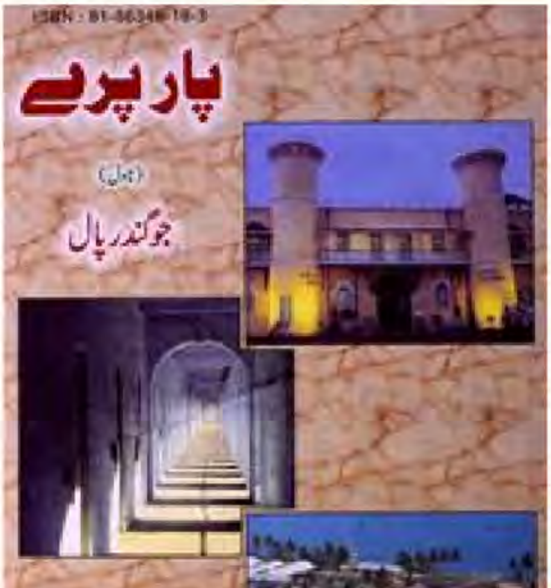

ناول'' پار پرے'' میں جالم سنگھ کا کردار ایک ایسا دلچسپ اور عجیب وغریب کردار ہے، جو اپنے حرکات وسکنات سے اور اپنی باتوں سے ہمیں

کسی اور ہی دنیا کا باشندہ محسوس ہوتا ہے۔ جالم (ظالم) ہمیں بتاتا ہے کہ نام سے کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز انسان کا کام یعنی اس کے اعمال ہیں۔ جالم سنگھ کے کردار میں ہمیں جوگندر پال کی خود کی معصومیت اور انسان دوستی کا احساس ہوتا ہے۔ جالم سنگھ ایک ایسا انسان ہے جس کا دل بے حد معصوم ہے، جو ہر وقت انسان کی بھلائی اور خدا کی مخلوق کی خدمت کا تصور رکھتا ہے۔ جس کے دل میں اللہ، بھگوان، گاڈ، واہگورو کے لیے تفرقہ نہیں ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ سب انسانوں کا رب تو ایک ہی ہے۔ جوگندر پال کا یہ کردار ہمیں دنیا کے تمام مذہب کے انسانوں سے محبت کا درس دیتا ہے اور دنیا میں بھائی چارے کا پیغام پہنچاتا ہے۔

بظاہر تو ''پار پرے'' کا موضوع بحر ہند میں واقع جزائر انڈومان نکوبار کی سیلولر جیل ہے، جہاں تقسیم ہند سے قبل انگریزی حکومت ہندوستانی مجرموں کو کالے پانی کی سزا سناتی تھی۔ یہ سزا زندگی میں ایک ہی بار ملتی ہے لیکن بار بار موت کا تصور پیش کرتی ہے۔ پھر محبان وطن ملک وقوم کی آزادی کے لیے برطانوی حکمرانوں کے ظلم کا مقابلہ کرتے رہے اور آخر کار انگریزوں سے آزادی حاصل کر ہی لی۔

موضوعاتی سطح پر اس ناول کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا مرکزی موضوع یعنی سیلولر جیل کے علاوہ بھی اور کئی موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں جو جزائر انڈومان نکوبار کے چاروں طرف پھیلے پانی میں اندر ہی اندر کسی زیریں لہر کی طرح اٹھتے بیٹھتے اور مچلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ موضوعات قومی یکجہتی، انسانوں کی معصومیت، فرقہ واریت اور عام انسانوں کی چھوٹی بڑی خوشیاں اور ان کا درد وکرب وغیرہ ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''مولوی کو بھنے ہوئے چنے بہت مرغوب تھے، ''بھنے ہوئے چنے؟''
> اس کی جیبیں بھنے ہوئے چنوں سے بھری رہتی تھیں۔ ''لو، تم بھی لو۔''
> ''چار دانے میرے لیے بھی نکال دے مولویا۔''
> جالم سنگھ نے آگے بڑھ کر اس کے سامنے اپنی ہتھیلی کھول دی۔ ''موئے جھے تو ایوائی پھکر کھائے رکھ دی ہے مولویا، کے جنت میں تو سر پھ دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، تجھے او تھے بھنے ہوئے چنے کیسے ملیں گے؟_____ ''مولوی کے چنے منہ میں پھانک کر وہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگتا۔ ''پر تو پھکر مت کر۔ جنت بیکنٹھ ساب سے بس اتنی ہی دور ہوگی جتنا سمڑے سے سیالکوٹ۔ دونّی چونّی کے ٹکٹ پر ہی تیری جنت آن پہنچتی ہوگی، میں پیچھے کے پیچھے تیرا پورا راشن پہنچا آیا کروں گا، چنے ہی تو ہیں، کوئی ساڈھا کڑاہ پرشاد تو نہیں_____''
> (ایضاً، ص:42)

مصنف نے ان عام انسانوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے، ساتھ ہی ہندوستان کے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کی بہترین مرقع کشی کی ہے۔

> ''کالے پانی کی سزا سے پہلے کالے خان افغانستان کی سرحد سے جڑے ہوئے برٹش انڈیا کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھا اور اس کا افغانستانی علاقے میں ہر روز اس طرح آنا جانا تھا گویا دونوں ملکوں کے درمیان کوئی سرحد واقع نہ ہو۔ ان دنوں انگریز فوجیوں کے سر پر افغانوں کی سرکوبی کا بھوت سوار تھا۔ (ایضاً، ص:67)

دراصل ناول ''پار پرے'' مجرموں کی کہانی ہے۔ ایسے مجرم جنھیں وقت نے مجرم بنا دیا ہے یا پھر انگریز حکومت نے زبردستی مجرم قرار دے کر کالے پانی کی سزا سنا دی ہے۔ مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ مجرم دل کے صاف ہیں۔ ان کے دل میں کسی کے لیے بھی بغض وکینہ نہیں ہے۔ یہ انسانوں سے ہی نہیں جانوروں تک سے محبت کرتے نظر آتے ہیں۔ دنیا کو خوش اور آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان مجرموں کی کہانیاں شروع تو ہوتی ہیں مگر کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ حد تو یہ ہے کہ کردار کے مرنے کے بعد بھی اس کا خاتمہ نہیں ہوتا، اس کا ذکر ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ اس جملے پر غور فرمائیں:

> ''جب ہم آپ یادداشت کھو بیٹھیں تو ہماری یادداشت بھی ہماری تلاش میں نکلی ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص:56)

جوگندر پال نے ''پار پرے'' کا تانا بانا اتنی مہارت سے بنا ہے کہ اس نئے دور میں مشکل موضوع کو بھی انھوں نے اپنے مشاہدے، تجربے اور انداز تحریر سے اسلوب کی ایک نئی بنیاد رکھی ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار بابا لالو اور گوراں چاچی ہیں اور تیسرا اہم کردار جالم سنگھ کا ہے۔ ان تینوں کرداروں کے سہارے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے اور آگے جا کر مزید کردار اس کہانی سے جڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر ثروت خان کے مضمون ''ایک انوکھا ناول'': پار پرے سے یہ اقتباس نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا:

> ''پار پرے صرف اسی خاندان کی کہانی نہیں بلکہ کئی اور کردار ہیں، جن کے تذکروں سے پلاٹ کی ترتیب ہوتی ہے اور

پورٹبلیئر میں زندگی کے بھرپور نقش ونگار ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کی رنگارنگی، افراد کی چہل پہل، ان کے اعمال، ان کے قصے، سب ایک کے بعد ایک کڑی در کڑی اس طرح جڑتے چلے جاتے ہیں کہ ان مجرموں کے شہر میں بھی زندگی رقص کرتی نظر آتی ہے۔''

(ثروت خان، شورش فکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2014، ص 232)

بابالالو کو ایک عورت ستیہ وتی کے خاوند کے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر کے کالے پانی کی سزا سنائی جاتی ہے جبکہ گوراں چاچی نے اپنے ایک گراہک کا قتل کر دیا تھا، جس کی پاداش میں وہ سیلولر جیل پہنچتی ہے۔ بابا لالو پہلے بیرکوں میں پتھر توڑنے کا کام کرتا تھا۔ بعد میں اسے بیرکوں کے Mess میں کھانا پکانے پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک دن کھانا تقسیم کرتے ہوئے بے خیالی میں گوراں چاچی کی کٹوری میں دال کم ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے گوراں چاچی غصہ ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد بابا لالو گوراں چاچی کو دوسروں سے زیادہ دال دینے لگتا ہے اور چوری چوری اس کو دیکھتا بھی رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ چاچی کا غصہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں محبت کی راہوں پر قدم بڑھا دیتے ہیں۔

جوگندر پال نے جہاں ایک طرف کالے پانی کی اذیت کو دکھایا ہے وہیں دوسری طرف اس مشکل بھری زندگی میں ایک خوبصورت زندگی جینے کا حوصلہ دکھایا ہے کہ انسان اگر خوشیاں حاصل کرنا چاہے، محبت کا پیغام بانٹنا چاہے تو قید و بند کی مشقت بھری زندگی میں بھی وہ محبت اور اخوت کا پیغام دے سکتا ہے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا بنا سکتا ہے۔ بابالالو اور گوراں چاچی کے بیچ زندگی کے عہد و پیماں کی گفتگو ملاحظہ ہو:

''تم پہلے مرد ہو لالو، جس نے مجھ سے شادی کی بات کی ہے۔'' چاچی گوراں نے کسی گرہستن کی طرح اپنا سر ڈھانپ لیا۔ ''مجھے ساری عمر حصے سے دگنی دال بانٹا کرو گے۔''

''تو تمھیں منظور ہے؟''

''منظور کیوں نہیں ہوگا رے؟ ایک دم عمر بھر کا سودا کرنے پر راضی ہو گئے ہو، یہ کوئی معمولی بات ہے؟''

تھوڑی دیر میں جب وہ وہاں سے اٹھنے لگے تو لالو نے ہنس کر دلہن چاچی سے پوچھا۔ ''مجھے بھی دھکا دے کر گرا تو نہ دوگی بی بی؟''

''مجھے بی بی مت کہو۔'' چاچی نے اپنا دوپٹہ سر سے جھٹک دیا، ''کسی کنجری سے کبھی واسطہ پڑا ہے؟'' وہ اپنے مرد کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ''ہم لوگ بدنام ضرور ہیں پر پائی پائی کا حساب چکائے بغیر اپنا دم بھی نہیں نکلنے دیتے۔''

(پارپرے، ص 19)

اس جیل کے سیٹونز صاحب (جیلر) کی کوششوں سے تمام امن پسند قیدیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور تمام قیدیوں کے مستقل قیام کے لیے معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ بابا لالو اور گوراں چاچی دوسرے سزا یافتہ مجرموں کی طرح پورٹ بلیئر میں ہمیشہ کے لیے بس جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بابالالو کے نام سرکار نے جو زمین الاٹ کی تھی، اس پر مکان کی تعمیر شروع ہوتی ہے، جس کی تعمیر میں گوراں چاچی کے وہ پیسے کام آتے ہیں جو اس نے جیل میں جمع کیے اور باقی بابالالو کے جگری دوست مہنت جالم سنگھ نے مدد کی ہے۔ مکان تعمیر ہو جانے کے بعد بابالالو گوراں چاچی اس میں رہنے لگتے ہیں۔ جب کہ جالم سنگھ گوردوارے میں ہی رہتا ہے۔

اسی طرح دوسرے قیدی مثلاً ماسٹر اللہ دتا، ایشر سنگھ، کالے خان، خدیجہ، عمران، باؤلی دادی، رام کشور، ڈاکٹر کرشن چندر، مولوی منظور احمد، شہاب الدین عرف شبو چور، پنڈت تلسی دھر، چمنی پہلوان، شیو شنکر، شری رام اور سیٹھ گردھر وغیرہ اپنی اپنی قید پوری کر کے 'قصے والی گلی' کو آباد کرتے ہیں۔ جن میں آپس میں میل ملاپ اور محبت ہے، یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''قصے والی گلی کے موجودہ مکین عام طور پر کھاتے پیتے لوگ ہیں اور جن کا ہاتھ تنگ ہے گلی والے ان کی کچھ ایسے گپت مدد کرتے ہیں گویا وہ اپنی ہی پونجی کو کام میں لا رہے ہوں۔ اولین مکینوں میں بیشتر یکے بعد دیگرے اٹھ گئے اور جو باقی بچے ہیں ان کا بھی اب بابالالو کے مانند چل چلاؤ ہے۔ قصوں والی گلی نے اب دوسری اور تیسری نسل کے قصے بننا شروع کر دیے ہیں۔'' (ایضاً، ص 77-76)

قصے والی گلی کی دوسری نسل یعنی بابالالو کا پہلا بیٹا جس کو پیدا ہوتے ہی جالم سنگھ نے لے لیا تھا اور اس کا نام بیکل سنگھ رکھا۔ جالم سنگھ نے بیکل سنگھ کی پرورش بہت محبت اور نہایت اچھے طریقے سے کی تھی۔ بیکل کی شادی کے موقع پر کیا خوبصورت مسئلہ درپیش آتا ہے۔ اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''فادر ڈینیل بخش نے لاکھ زور لگایا کہ بلّو اور بیکل کی شادی عیسائی ریتی رواج کے مطابق چرچ میں انجام پائے، پر جالم سنگھ اڑ گیا کہ وہ اپنے بیکل کا بیاہ خود آپ گرنتھ صاحب کے روبرو گوردوارے میں کرائے گا۔

'اوئے میرے پیارے فادر، میری بات کا ن دھر کے سن۔'' جالم سنگھ فادر کو سمجھا تا رہا۔'' تمہارا یسوع وا ہگورو کا ہی پتر ہے نا____ بول، ہے کہ نہیں؟ ہے!____ تو پھر اسے بھی اپنے وا ہگورو کے سامنے بیٹھ کے بیاہ کا نجارہ کرنے سے کیاؤں روکدیے ہو؟____ کیسے پھادر ہو پھادر؟ باپ بیٹے کومل بیٹھنے کا موکا مل ریا ہے تو انہوں کومل بیٹھنے دو، کیاؤں ان کے ملاخات میں روڑا اٹکاتے ہو؟____''

یہ اچھا ہوا کہ جالم کی بات آخر فادر کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے حامی بھرلی ورنہ جالم نے سوچ رکھا تھا کہ وا ہگورو کو ہی فادر کو منوانے کے لیے بھیجے گا۔

مگر جالم سنگھ کو معلوم نہ تھا کہ وا ہگورو اس سے کچھ کہے بغیر خود آپ ہی فادر کے پاس جا پہنچا تھا۔ فادر نے ہی ایک دن جالم کو بتایا تھا، تم نے بڑی کٹھن سمسیا کھڑی کردی تھی، مگر تمہارے وا ہگورو نے خود آپ ہی آ کر ساری بات مجھے سمجھائی تو مجھے پتہ چلا، کہ تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔

''اس نے اچھا ہی کیا جو آپ ہی تمہارے پاس چلا گیا، میں ہمیشاں ٹھیک ہی کہنداں ہوں، پر سمجھانا تو اسی کا کام اے۔''

(ایضاً،ص 54-53)

بابالالو اور گوراں چاچی کا دوسرا بیٹا محمد علی ہے جس کی پرورش مولوی منظور احمد کے کہنے پر اسلامی طریقے سے کی جاتی ہے۔ بابالالو کو اپنے چھوٹے بیٹے علی پر بڑا ناز تھا۔ وہ بی اے پاس کر کے پورٹ بلیئر کے ایک اسکول میں ٹیچر ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ایل ایل بی کی پڑھائی بھی کر رہا تھا۔ انھیں دنوں علی کو ایک جاروائی لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے۔ علی اور سو نوں ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے ہیں اور ان دونوں کی بھی شادی کردی جاتی ہے۔ لیکن ان کی خوشی صرف چند دن ہی رہتی ہے اور محمد علی کو ایک جھوٹے قتل کے کیس میں تازندگی قید کی سزا ہو جاتی ہے جس کے غم میں بابالالو اور گوراں چاچی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں اپنی زندگی کی مشقتیں یاد آتی ہیں کہ کالے پانی کے کئی سال کی سزا میں ہم نے کیسی کیسی مشکلیں جھیلیں ہیں۔ ناول کے اختتام کا یہ اقتباس دیکھئے:

''میری کہانی تو پوری ہولی ہے۔ مگر کہاں پوری ہوئی ہے۔ پٹ سن صاحب؟ وہ تو بمبئی جیل میں جا کھوئی ہے، اور اس کی پرچھائیاں مجھے یہاں گھیرے رکھتی ہیں۔

خدارا میری مدد کیجئے____ خدارا پٹ سن صاحب، جو بھی ہونا ہے وہ سارے کا سارا ایکدم ہو جانے دیجئے۔

ہاں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟____

ہاں، پٹ سن صاحب، کوئی پوری کہانی بھلا کہیں پوری ہوتی ہے؟____!'' (ایضاً،ص 132)

دنیا کی کسی بھی بستی میں جہاں بیشتر افراد حق پسند، محبت کرنے والے اور اخوت و بھائی چارے کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہوتے ہیں، وہیں چند اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو تخریبی ذہن رکھتے ہیں۔ انھیں امن و آشتی ناپسند ہوتی ہے اور وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی چند لوگ جوگندر پال کی اس انوکھی بستی میں موجود تھے جنہیں قصے والی گلی کا چین وسکون کا ماحول بے چین کیے ہوئے تھا جنھوں نے سیاست کا سہارا لے کر فرقہ واریت کا بیج بو دیا تھا۔

پورٹ بلیئر میں بگڑتے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے علی اور سُو وہاں عوام کی امن و سلامتی اور اتحاد کے لیے لوکل بار ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لاتے ہیں۔ علی اور سُو کے علاوہ ادارے کے دیگر ممبران بھی دلچسپی سے کام کرتے ہیں اور پورٹ بلیئر کو امن و آشتی کا گہوارہ بنانے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ پنڈت تلسی دھرا اور ان کے رفقا فرقہ وارانہ فساد پیدا کرنے کے ارادے سے پنڈت چکرورتی کو لکھنؤ سے ایک جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔

اگلے دن آریہ سماج کے میدان میں پنڈت چکرورتی کی اشتعال انگیز تقریر سے عوام بھڑک اٹھتی ہے۔ عوام دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو جاتی ہیں۔ اس افراتفری میں سیٹھ گردھر کے چند حمایتی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس قتل وخون کی سازش میں محمد علی اور امر سنگھ اور دوسرے ملزمین کو حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ دہشت پسندی کے الزام میں محمد علی اور امر سنگھ کو حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ شری رام، پٹ سن صاحب اور بابالالو وغیرہ محمد علی کو سمجھاتے ہیں۔ مگر علی اپنے اصولوں کا سخت پابند ہے۔ وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتا کرنے سے منع کر دیتا ہے۔

پانچ مہینے تک عدالتی کارروائی چلتی رہتی ہے۔ اس عدالتی کارروائی میں دیگر ملزمین تو بری ہو جاتے ہیں مگر محمد علی اور امر سنگھ کو عمر قید کی سزا سنائی جاتی ہے۔ ان دونوں کو پورٹ بلیئر کی جیل سے دائمی قید کے لیے ممبئی منتقل کر دیا جاتا ہے۔

جوگندر پال کا اپنے مخصوص انداز میں لکھا گیا یہ ناول اردو ناولوں میں ایک اہم مقام کا حقدار ہے۔ یہ ناول اپنے ماجرے اور نقطۂ نظر کے

حوالے سے ایک کامیاب اور بہترین ناول قرار دیا جاتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ ناول اپنے ہم عصروں میں انفرادیت کا حامل ہے۔

زبان و بیان اور تکنیک

زبان وبیان:

عظیم فنکار کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر ان کے فن پارے کو ان کا نام ہٹا کر بھی پڑھا جائے تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ کس قلم کار کے قلم کی روشنائی ہے۔ ایسے ہی عظیم فنکاروں کی فہرست میں جوگندر پال کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یوں تو ہر فنکار کا اپنا ایک الگ اسلوب نگارش ہوتا ہے اور اس کا اپنا ایک انداز تحریر ہوتا ہے مگر جوگندر پال کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا اسلوب، تکنیک اور انداز بیان بالکل ہی نرالا ہے۔ ایک ایسا انداز جو کسی سے بھی مستعار نہیں لیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنا راستہ خود چنا ہے، جس کی مثال کے لیے ناول ''پار پرے'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے عہد کے بیشتر فکشن نگار ایسے ہیں کہ انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کا استعمال اپنے فن کو نکھارنے میں کم اور اپنے فن کو مقبول بنانے میں زیادہ صرف کیا ہے، لیکن جوگندر پال ان چنندہ کہانی کاروں میں سے ہیں جنھوں نے تمام عمر اپنے فن اور اپنی صلاحیتوں کو سنوارنے میں لگائی۔ اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کی کہ ادب کے 'ٹھیکیدار' ان کی کوئی اوقات یا حیثیت سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔

مذکورہ ناول میں جوگندر پال نے سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں جوگندر پال نے اپنے خیالات سے ایسی خوبصورت تصویر کھینچی ہے کہ قاری ان کرداروں کی محبت میں کھنچا چلا آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ درمیان میں فلسفیانہ گفتگو بھی اس انداز سے کرتے جاتے ہیں کہ جس کو سمجھنے میں مشکل درپیش نہیں آئے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''بابا لالو اپنی خوشی کو سہار نہ سکا اور گونگی بڑھیا کو مبارکباد دینے کے لیے بے اختیار اس کی طرف بڑھ آیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہا، جس پر گونگی بڑھیا لجا سے سرخ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اپنے برف جیسے سفید سر کو پلو سے ڈھانپنے لگی تو یہی لگا کہ اس کے سفید بالوں میں سیاہی بھر آئی ہے۔'' (ایضاً،ص:51)

جوگندر پال اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ زبان جس قدر کردار اور صورت حال کے مطابق ہوگی وہ فن پارہ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ جوگندر پال ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے کرداروں سے ایسی ہی زبان کا استعمال کرائیں جو اس کی فطری زبان ہے اور جس ماحول میں اس کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے۔ کسی بھی ناول نگار کے لیے زبان و بیان کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس آزمائش سے وہی فنکار با آسانی اور خوبصورتی سے نپٹ سکتا ہے جو زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہو۔ ناول ''پار پرے'' میں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے اپنے کمال وفن کا خوب جوہر دکھایا ہے۔ وہ اپنے ناول میں کرداروں کو جس طبقے اور ماحول سے تراشتے ہیں اسے وہی زبان دے دیتے ہیں۔ مثلاً چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

> ''اسے شرم آتی ہے بابا، کہ میرے ساتھ رہے گا تو لوگ اسے چور کا بیٹا کہیں گے۔'' اس نے آنکھوں کا پانی آستین سے پونچھا ہے۔ ''وہ تو مجھے چوری میں بے مطلب پھانس لیا گیا بابا، تم ہی بتاؤ بنک میں ڈاکہ ڈالا جاتا ہے، یا چوری کی جاتی ہے؟'' (ایضاً،ص83)

کوئی بھی فن پارہ خواہ وہ غزل ہو، نظم ہو، افسانہ ہو یا پھر ناول ہو، وہ اس وقت تک فن پارہ کہلانے کا حقدار نہیں ہے جب تک اسے پڑھ کر قاری کو جذبات کے سمندر میں ڈوبنے اور ابھرنے کا احساس نہ ہو۔ قاری کو لگنا چاہئے کہ وہ اس فن پارے کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتا جارہا ہے اور پھر اچانک اسے ایسا محسوس ہو جیسے جذبات کے سمندر میں تیر رہا ہو اور پھر

ایسا لگے جیسے اس سمندر کی لہروں نے اسے اچھال کر کنارے پر لا کر پٹخ دیا ہے۔ ایک باشعور قاری جب کسی کامیاب تخلیق کو پڑھتا ہے تو اسے ایسے جملے، مکالمے اور اقتباس کا سامنا ہوتا ہے جسے پڑھ کر اسے مذکورہ احساسات کا سامنا ہوتا ہے۔ ناول ''پار پرے'' میں اس طرح کے احساسات کو سمجھنے کے لیے چند اقتباسات حاضر ہیں:

''وہ ذرا سا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اس کا دا اگھورو گھبرا کر اس کے کمرے میں دوڑا دوڑا آیا ____ کیوں، کیا ہوا جالمے؟ ____ جالمے۔'' (ایضاً ص:56)

''جب شبو چور سے اس سے پندرہ بیس سال بڑی رحمتاں نے پوچھا، کیا تمہیں تم سے چرالوں، چورا؟ ____ تو وہ جھٹ ہی راضی ہو گیا۔ تم ہی سہی، اور تو کوئی میرے مال ومتاع کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔'' (ایضاً ص:82)

''گوراں چاچی بابالالو سے کہا کرتی ہے، دادی اگر یہاں شادی کر لیتی تو الہ آباد سے یہاں آ پہنچتی۔
مگر بابالالو اسے جواب دیتا ہے، الہ آباد سے یہاں پہنچتی تو شادی کرتی۔'' (ایضاً ص:76)

تکنیک

جوگندر پال اپنی کہانیوں اور ناولوں میں الگ الگ تکنیک کا استعمال کر کے اسے دلچسپ اور معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ یہی دلچسپی اور معنی خیزی ان کے ناول ''پار پرے'' میں ملتی ہے۔ اس ناول میں جوگندر پال نے ''قصے والی گلی'' کے نام سے جس بستی کو متعارف کرایا ہے وہ آئیڈیل بستی ہے۔ ایک ایسی انوکھی ونرالی بستی جس میں قاتل، گنہگار، چور، لٹیرے بے پناہ معصومیت اور محبت کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں، جبکہ اس بستی سے باہر جہاں شعور ہے، علم ہے، دانشمندی ہے، عقل ہے اور ترقی کی نئی نئی ترکیبیں ہیں، اس بستی میں محبت وانسانیت عنقا ہے۔ ان لوگوں میں حیوانیت آ چکی ہے۔ یہ ترقی یافتہ بستی ایک جنگل راج بن چکی ہے۔ جوگندر پال لکھتے ہیں:

''دلی کی بھیڑ میں اگر کوئی چوکس ہو کر نہ چلے تو کوئی غنڈہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اس دوران اگر اس کام سے بڑے کام کی صورت نکل آئے تو وہ اس راہگیر کو بیچ کر اپنے پیسے وصول کر کے اسے کسی اور غنڈے کے حوالے کر دیتا ہے۔''

(ایضاً ص:77)

اس ناول میں جوگندر پال نے الگ الگ مقام پر کئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں یہ ناول آپ بیتی کی تکنیک میں ہے اور کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہانی فلیش بیک تکنیک پر چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ جوگندر پال نے اپنے کرداروں کے ذریعہ خود کلامی کی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔

جوگندر پال نے اس ناول میں بیانیہ کی تکنیک کے ذریعہ سے بھی کام لیا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعہ انہوں نے ایک مثالی اور شاندار بستی کا تصور پیش کیا ہے۔ ایسی بستی جس میں محبت ہے، خلوص ہے، ہمدردی ہے اور انسانیت ہے۔

ناول ''پار پرے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب ''اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''پار پرے'' میں کالے پانی کو موضوع بناتے ہوئے جوگندر پال نے آج کے ہندوستان کے اس سماج کو پیش کیا ہے جس میں خیر وشر کی قوتیں قدم سے قدم ملا کر رواں ہیں۔ ان کے یہاں حقیقت نگاری محض ایک طرف احساس زندگی، مثلاً رجائیت یا قنوطیت کا نام نہیں۔ وہ زندگی کی ماہیت کا ادارک رکھتے ہیں جس میں ایک طبقے کے لیے زندگی مکمل قید خانہ ہے اور دوسرے کے لیے جنت۔ وہ اس بات کی کھوج لگاتے ہیں کہ ان کا کردار کس طرف، کس مقام پر کھڑا ہے، خیر کی جانب یا شر کی جانب؟''

(ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس کراچی 2012، ص:70)

مجموعی طور پر جوگندر پال کا یہ ناول ایک بہترین فن پارہ ہے۔ اپنی گفتگو کا اختتام میں جوگندر پال کے ان الفاظ کے ساتھ کرنا چاہوں گی:

''بحیثیت ادیب، میں اپنی ذات میں بے شناخت ہوں یا میری شناخت کے نقوش کائنات کے سبھی مظاہر میں مضمر ہیں، میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہی بن جاتا ہوں۔ یہی میری شناخت ہے۔''

(راشد انور راشد، فکشن مکالمہ، شعبۂ اردو علی گڑھ 2012، ص:161)

□□□

Dr. Tarannum Jabeen
CIET, NCERT
New Delhi-110016
E-mail:tarannumjabeen526@gmail.com

ڈاکٹر عدیلہ جسیم

اکیسویں صدی کی اہم خواتین کے سفرناموں کا مجموعی جائزہ

سفر کے لغوی معنی ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ بستر سے اٹھ کر روزمرہ کے کاموں کو انجام دینا جس میں کھانا، پینا، دفتر جانا، کالج جانا، لکھنا پڑھنا، گھومنا پھرنا سب سفر کی ہی چھوٹی چھوٹی اکائیاں ہیں۔ انسان ایک جگہ ٹھہرا بھی ہو تو اس کا ذہن سفر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے جسم میں روح دو طرح کی ہوتی ہے۔ روح قائمہ اور روح سائرہ اور یہی روح سائرہ نیند کی حالت میں سفر کرتی ہے۔ اس لیے سفر کے بغیر زندگی کا تصور ممکن ہی نہیں ہے ایک ساکت اور جامد انسان پتھر کی مانند ہے اور زندگی اسفار کا مجموعہ ہے۔ بظاہر تو ہم سب کسی نہ کسی طرح زندگی میں سفر کرتے ہی رہتے ہیں لیکن سفرنامہ تب وجود میں آتا ہے جب کوئی ادیب کسی مقصد کے تحت سفر کرتا ہے اور اپنے روزمرہ کے حالات و واقعات اور تجربات و مشاہدات کو ادب کے قالب میں تحریر کر دیتا ہے حالانکہ سفر ہر عام و خاص کرتے ہیں لیکن اس کو تحریر میں کم ہی لوگ لا پاتے ہیں اس لیے دوسری اصناف کے مقابلے سفرنامے کم وجود میں آئے اور خواتین یہاں بھی وہ بہت پیچھے نظر آتی ہیں۔

عورت اور مرد کے بنیادی ڈھانچے میں فرق اللہ نے ضرور بنایا ہے لیکن اس کی صلاحیتوں میں فرق لانے کا سب سے بڑا سبب یہ سماج بنتا ہے۔ یہ بات میں کسی مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ سائنٹیفک نظریہ سے کہہ رہی ہوں۔ چند گنے چنے درندہ صفت انسان دنیا میں نہ ہوں تو وہ بلا خوف زندگی کے کسی بھی شعبہ میں اپنی برابری ثابت کر سکتی ہیں۔ میں مساوات پر زور دینا چاہوں گی کیونکہ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ بات شروع تو برابری کے لیے ہو لیکن ختم برتری پر ہو۔ اس طرح ہم اپنے سوال سے خود ہی گمراہ ہو جاتے ہیں اور یہ ہرگز ہمارے لیے سازگار حالات پیدا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے یہ بالکل غلط ہے کہ عورت سماج کو اپنا مخالف بنائے بلکہ برابری کہ لیے مخالفت زہر ہے۔ کیونکہ مخالفت ہمیشہ برتری چاہتی ہے اور ناموافق حالات پیدا کرتی ہے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جب جب سماج نے ان کے لیے موافق حالات پیدا کیے ہیں تو خواتین نے عمدہ کارکردگی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ تعلیم ہر مرد اور عورت کے لیے فرض کیا گیا ہے، اس لیے تعلیم حاصل کریں اور اپنے لیے مواقع پیدا کریں۔ حقوق مانگنے کے لیے حقوق جاننے بھی پڑتے ہیں ورنہ آپ کے حقوق وہی ہوں گے جو دوسرے لوگ آپ کے لیے طے کریں گے۔ بیشک جب آپ اپنے حقوق کے بارے میں بات کریں گی تو دوسروں کے حقوق بھی ادا کریں گی اور یہی مساوات قائم کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ تعلیم کے لیے بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ سماج کو درکنار کر کے حاصل کی جائے۔ سب سے پہلے آپ کے گھر کے لوگ ہی آپ کے لیے ایسے مواقع پیدا کرتے ہیں جو آپ کو

آگے بڑھنے میں مدد کرتے ہیں۔ یقیناً یہ آپ کے خاندان کے لوگ ہوتے ہیں اور اسی سماج کا حصہ ہوتے ہیں۔

میں بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ فرق صرف انھیں مواقع کا ہے جو عورتوں کو کم اور مردوں کو زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں بھی ایسی ڈھیروں مثالیں موجود ہیں کہ خواتین نے اپنا تعاون کیا اور ادب کو اپنے جذبات و احساسات سے نوازا۔ ایک وقت تھا کہ جب ہندوستان میں فلمیں بنتی تھیں ان میں عورتوں کے کردار تو ہوتے تھے لیکن ان کو ادا کرنے والے مرد حضرات ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ ان کا روپ تو دھار سکتے تھے لیکن وہ احساسات و جذبات، وہ زبان و بیان اور ناز و ادا چاہ کر بھی پیدا نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ اس کی اصل وجہ ایک تو ودیعت خداوندی ہے۔ دوسری یہ کہ پدری سماج حائل رہا اور ان کی مشرقیت بھی انھیں باہر نکلنے میں مانع ہوئی۔ آج جب حالات نے انھیں موقع دیا تو نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ مردوں کے مقابل یہ تعداد میں کم ضرور ہیں لیکن کمتر نہیں اس لیے یہ بھی اتنی ہی توجہ کی قابل ہیں۔

دیکھا جائے تو اردو ادب کی باقی دوسری اصناف سے سفرنامہ لکھنے کی ابتداء دیر سے ہوئی۔ اس میں خواتین کی حصہ داری مزید تاخیر سے ہوئی۔ خواتین کے سفرنامے مردوں کی بہ نسبت الگ نوعیت کے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں میں احساسات و جذبات کا فرق ہے۔ دونوں میں چیزوں کو دیکھنے کے زاویے الگ الگ ہیں۔ خواتین اندرون خانہ جھانکنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں اور چونکہ وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں اس لیے سماج کے دکھ درد کی زیادہ گہرائی سے عکاسی کرتی ہیں اور یہ باتیں ان کے سفرناموں میں بھی واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اب تک کم و بیش دو ہزار سفرنامے اردو میں لکھے جا چکے ہیں۔ جس میں خواتین کے مشکل سے سو(100) یا سوا سو(125) ہی نظر آتے ہیں۔

خواتین کے سفرنامہ لکھنے کی ابتدا 1906 سے ہوئی۔ سلطان جہاں بیگم کا ''روضۃ الریاحین''، امت الغنی نور النسا کا ''سفرنامۂ حجاز و مصر شام'' محمودہ عثمان حیدر کا ''مشاہدات بلاد اسلامیہ''، بیگم حسرت موہانی کا ''سفر عراق'' اور صغرا بیگم حیا کا ''سفرنامۂ عراق''، صغرا بیگم کا ''سفرنامہ پونہ و مدراس اور سیر یورپ، نازلی رفیعہ کا ''سیر یورپ'' شاہ بانو کا ''سیاحت سلطانی''، بیگم سربلند جنگ کا ''دنیا عورت کی نظر میں''، صغرا بیگم حیا کا ''سیر یورپ'' عطیہ فیضی کا ''زمانۂ تحصیل'' اور بیگم حبیب اللہ کا ''تاثرات سفر یورپ''، جو قبل آزادی سے پہلے لکھے گئے تھے۔ عطیہ فیضی کو چھوڑ دیا جائے تو یہ تمام خواتین پردے کا اہتمام کرتی تھیں اور اپنے نام تک کو پوشیدہ رکھتی تھیں۔ اپنے شوہروں کے نام سے ہی لکھا کرتی تھیں۔ جس کی بنا پر ان کے اصل نام کا پتہ لگانا ایک مشکل اور پیچیدہ امر تھا اور بہت مشقت اور جانفشانی کے بعد ان کے نام اور خاندان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہو سکی ہے۔ چونکہ اس وقت سفر پانی کے جہاز سے طے ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے سفر میں جہاز کے حالات اور ان میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ان خواتین کے اسلوب سادہ اور عام فہم ہیں تھوڑی مشکل اور پیچیدہ زبان بیگم سلطان جہاں کے سفرنامے کی ہے۔

تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی خواتین کے جو سفرنامے وجود میں آئے ان میں پہلے کی خواتین کی طرح رعب و دبدبہ تو نہیں لیکن یہ خواتین ان سے زیادہ پر اعتماد نظر آتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر خواتین تعلیم و تدریس سے جڑی ہوئی تھیں اور اکیلے سفر کر لینے کی پوری صلاحیت اور ہمت رکھتی تھیں۔ اس دور میں بحری سفر کے ساتھ ہوائی سفر بھی شروع ہو چکے تھے اور سفر پہلے کی طرح مشکل نہیں رہا تھا اور پھر جب خواتین کی تعلیمی شرح میں گو نا گوں اضافہ ہوا تو وہ بھی آزادانہ طور پر سفر کرنے لگیں جس سے ان کے سفرناموں کے لکھنے کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتے گئے اور مقاصد بھی تبدیل ہوئے۔ مردوں کی طرح ان کا سفر بھی مذہبی، تعلیمی، تدریسی، تجارتی، تربیتی، ادبی اور تفریحی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہ خواتین پہلے کی طرح اپنے میاں کے ڈور سے بندھ کر سفر نہیں کرتی تھیں، ان کی آنکھوں سے دنیا کو نہیں دیکھتی تھیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی تھیں اور اپنے مقاصد بھی خود طے کرتی تھیں۔ پردے کی قید سے آزاد لیکن مشرقیت کا دامن تھامے یہ باشعور خواتین اپنے علم و ذہانت سے ادبی دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں اور ان تمام لبوں پر مہر لگا دیتی ہیں جو یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ تم یہ نہیں کر سکتی اور وہ نہیں کر سکتی۔ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ ان کے مقابل کھڑی نظر آتی ہیں۔

اکیسویں صدی کی وہ خواتین جنھوں نے ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ سفرنامے بھی تحریر کیے ان میں صغرا مہدی کا سفرنامہ ''سیر کر دنیا کی غافل''، میں ان کے کئی اسفار کا ذکر ہے اور یہ کئی مختصر سفرناموں کا مجموعہ ہے۔ ان کا سفر مکمل طور پر تفریحی ہے اور یہ اسفار ان کی شوق کی تسکین بھی ہے۔ باتوں باتوں میں معلومات بہم پہنچانے کا ہنر خوب جانتی ہیں لیکن کہیں کہیں بوریت سی ہونے لگتی ہے۔ اے امیر النسا کا سفرنامہ ''ارض مقدس میں چند روز''، میں کئی ممالک کی سیر کا تذکرہ ہے وہ ان ممالک کی ان جگہوں کی سیر کو بھی گئیں جہاں عموماً لوگ زیارت کے دوران بھی نہیں جاتے

ہیں اوران جگہوں کی مختصر لیکن معلوماتی تفصیل لکھی۔ ارض مقدس مدینہ منورہ و مکہ معظمہ کے ساتھ انھوں نے عمان، بغداد، کوفہ، جارڈن، غار اصحاب کہف، یروشلم کی بھی سیر کی۔ نگار عظیم نے اپنے سفر نامہ ’’گرد آوارگی‘‘ میں ازبکستان کو ایک خوبصورت خواب کی طرح پیش کیا ہے جسے پڑھ کر آپ کے اندر بھی اس ملک کی سیر کی خواہش جنم لے سکتی ہے۔ ازبکستان کی تاریخی، جغرافیائی اور سماجی صورت حال کے ساتھ وہاں کی تہذیب، رہن سہن، لباس، تجارت، فنکاری اور لوگوں کے عادات واطوار کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ صبیحہ انور کا سفر نامہ ’’دیکھا ہم نے استنبول‘‘ ترکی کی عہد زریں کی تاریخ سناتے ہے۔ وہاں کے عمارات و باقیات کے ذریعہ مسلمانوں کی 800 سالہ پرانی تاریخ بڑی تفصیل سے بتاتی ہیں اور کہیں کہیں تصوف کا رنگ بھی بھرتی ہیں۔ مساجد کا شہر استنبول میں وہ کئی مساجد کی سیر کرتی ہیں اور اس کی تاریخی اور جغرافیائی نقشہ کو کھینچ کر رکھ دیتی ہیں۔

پڑوسی ملک کی خواتین کے سفر نامے پر نظر ڈالی جائے تو تقریباً اسی طرح کی تعداد سامنے آتی ہیں لیکن دونوں ملکوں کے حالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے اس لیے ان کی تحریروں میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ صحیح معنی میں پاکستانی خواتین کی جدوجہد آزادی کے بعد بھی جاری رہی وسائل کی کمی اور سماج کی پابندیاں بہت بعد تک ان کے سامنے مشکلات کھڑی کرتی رہیں۔ انھوں نے ہار نہیں مانی اور مسلسل اپنے حقوق کی لڑائی لڑتی رہیں۔ پدری نظام نے ہر قدم پر انھیں آگے بڑھنے سے روکا لیکن وہ اور ابھر کر سامنے آئیں اور کبھی کبھی ضد میں اعتدال اور توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بھی دیتی ہیں۔ ادبی دنیا میں ان خواتین نے اپنے قدم اس طرح رکھے کہ کتنوں کے سر خم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لیے زیادہ تر خواتین نے اظہار کا وسیلہ شاعری، ناول نگاری اور افسانے لکھنے کو بنایا۔ اس لیے سفر نامے اور خودنوشت جیسی دوسری اصناف پیچھے رہ گئیں لیکن جب حالات نے کروٹ بدلی اور فضا ہموار ہوئی تو خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں تعلیم وتربیت کے ذریعہ خود اس مقام پر پہنچی کہ نہ صرف دوردراز کے علاقوں کا سفر کرنے لگیں بلکہ سفر نامے بھی تحریر کیے اور ادبی دنیا میں اس صنف میں بھی اپنی پہچان کو مستحکم کیا۔ یہ خواتین بے باک و بے لاگ لکھنے کے لیے مشہور ہوئیں۔ مغربیت کے اثرات جب ادب پر پڑے تو ان کی ذاتی زندگی بھی اس سے اچھوتی نہ رہی۔ ان میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اور شین فرخ وغیرہ اگلی قطار میں نظر آتی ہیں۔ ان خواتین نے اپنے علم ودانش کے جوہر خوب خوب دکھائے ان کی قلم سے کمال کے سفر نامے وجود میں آئے جو زبان و بیان کی ہی سطح پر نہیں بلکہ علمی اور معلومات کے لحاظ سے بھی معیاری ہیں۔ نگار سجاد ظہیر کا سفر نامہ ’’دشت امکاں‘‘ حج وعمرے کا سفر نامہ ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ کا بیان اس سفر نامے میں غیر معمولی طور پر کیا گیا ہے۔ اس سفر کو انھوں نے سیاحتی شوق کے ساتھ کیا اور زیارت کے مقامات کے علاوہ دوسرے تاریخی مقامات کی بھی سیر کی اور اسے ذکر میں لائیں۔ مکہ و مدینہ میں جتنی بھی توسیع ہوئیں اس کا ذکر تفصیل سے کیا اور جغرافیائی خاکے کے ساتھ پیش کر کے اس کو اور بھی دلچسپ بنا دیا۔ نجمہ افتخار راجہ کا سفر نامہ ’’سایونارا‘‘ جاپان اور تھائی لینڈ کے سفر کی روداد ہے ان دونوں ممالک کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ ذہن میں پورا خاکہ ابھر آتا ہے اور وہاں کے لوگوں کی چلتی پھرتی تصاویر نظر آنے لگتی ہیں۔ اس سفر نامہ کی زبان سادہ اور بیان دلچسپ اور بے تکلف ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کا سفر نامہ ’’سات سمندر پار‘‘ جاپان اور روس کے سفر کی داستان ہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے جاپانیوں کی صحیح تصویر اتار کر رکھ دی ہے۔ ان کی تحریروں میں عورتوں کے درمیان ہونے والی روزمرہ کی زبان استعمال کی گئی ہے ساتھ ہی مزاح اور بیان کے برملا اظہار نے اس سفر نامے کو اور بھی لذت بخشی ہے۔ بشریٰ رحمان کا سفر نامہ ’’براہ راست‘‘ فرانس، امریکہ اور کناڈا کے سفر پر مشتمل ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھی ناول نگار تھیں اس لیے ان کے سفر نامے میں ناول کی سی لذت اور زبان و اسلوب ملتا ہے۔ وہ ان ممالک کی تہذیب وثقافت کو تو اس میں پیش کرتی ہی ہیں ساتھ ہی اپنے سماج میں پھیلی برائی پر طنز کرتی ہیں اور اپنے ملک کی بدحالی کا رونا بھی روتی ہیں۔ بشریٰ اعجاز کا سفر نامہ ’’آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں‘‘ میں انھوں نے ہندوستان کے سفر کو قلم بند کیا۔ اس سفر کا مقصد پوری طرح سے ادبی تھا اور دونوں ملکوں کے شعرا اور ادبا کی جانب سے عوام کو امن و آشتی کا پیغام دینا تھا۔ ان کا سفر بہت محدود تھا لیکن ہندوستان کی تاریخ انھیں جیسے ازبر تھی چاہے وہ مہابھارت کی تاریخ ہو یا بزرگان دین کا ذکر ہو۔ اردو کے ساتھ پنجابی زبان کا استعمال بھی وہ اردو ہی کی طرح کرتی ہیں۔ کچھ پنجابی اشعار بھی اس سفر نامے میں درج ہیں۔ کشور ناہید کا سفر نامہ ’’آجاؤ افریقہ‘‘ افریقہ کے سفر پر مشتمل ہے۔ اس سفر کا مقصد دنیا بھر میں دبی کچلی خواتین کی حالت زار کا جائزہ لینا تھا۔ اس دس روزہ سیمینار کی روداد میں سفر کے حالات تو زیادہ نہیں ہیں لیکن دنیا بھر کی خواتین کی ابتری کے ساتھ خصوصی طور پر افریقہ کی خواتین اور وہاں کے پسماندہ طبقوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ ٹیبل کانفرنس کر کے دنیا کے کل ستائے اور پریشان حال لوگوں پر ظلم ستم کے لامتناہی داستان کو جاننے کی کوشش کرتی ہیں۔ حاصل شدہ حقیقت کو اپنی بے باک تحریروں کے ذریعہ اجاگر کر

دیتی ہیں۔شین فرخ کا سفرنامہ ''زرخیز پتھر''،ہندوستان اور ''نئی دنیا پرانی دنیا''امریکہ کے سفر کی روداد ہے۔انھوں نے ہندوستان کی ایسی جگہوں کی سیر کی ہے جہاں بہت کم لوگ ہی جاتے ہیں۔ہند کی ہزاروں سال پرانی وراثت ''اجنتا، ایلورا''،''ایلیفینٹا'' اور ''کھجوراہو'' کی غاروں کی سیر اور ان کے عام انسانی ذہن سے ہٹ کر تشریح کرنا،ان کی تحریروں کو دوسروں سے الگ کردیتی ہے۔''نئی دنیا اور پرانی دنیا''میں بھی ان کی تحریر سوچ اور فکر کے الگ احساس کو جنم دیتی ہے۔وہ چیزوں کے تاریک پہلو پر کم نظر رکھتی ہیں اور روشن پہلوؤں کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔''لالی چودھری کے سفرنامے''اس میں چار سفرنامے ہیں جس کو ڈاکٹر رفیعہ سلیم نے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا ہے۔اس میں دلی، پیرس، جنیوا، اور اندلس کے اسفار کا ذکر ہے۔سیر وسیاحت کا شوق اس قدر ہے کہ جب دل چاہا رخت سفر باندھ لیا اور اکیلے ہی چل دیے۔فن و فنکار کی قدردانی لالی چودھری میں عمارات ومجسموں سے بے پناہ دلچسپی پیدا کردیتی ہے اور اسی لیے وہ ان کی تاریخ سے بھی آگاہی حاصل کرتی ہیں اور قارئین کو بھی اپنی معلومات کا حصے دار بناتی ہیں۔سبوحہ خان تقسیم ملک کے تاریخی سانحہ کی چشم دید گواہ ہیں۔ان کا سفرنامہ کم خودنوشت ''دہلی سے ڈیفنس''میں ان کی زندگی کے تمام اسفار شامل ہیں۔وہ دو اسفار ایک ساتھ طے کرتی ہیں۔ایک ان کی زندگی کا سفر جو خیالوں میں طے ہو رہا تھا اور دوسرا امریکہ اور کناڈا کا۔بے حد سادہ، بامحاورہ اور روزمرہ کی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔اس میں بیان کا انداز اتنا اثر انگیز ہے کہ تمام کردار آنکھوں کے ذریعہ دل میں سما جاتے ہیں۔کردار اس لیے کہ یہ حقیقی کردار اپنے ساتھ کئی زندگیوں کا عکس لیے ہوئے تھے۔عشرت معین سیما کا سفرنامہ ''گامزن''اٹلی کے سفر پر مشتمل ہے جو ملک جرمنی سے طے کیا گیا تھا۔اس سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تین ملکوں کی تہذیبیں بھی سفرنامہ نگار کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔جرمنی جہاں وہ اب مستقل طور پر رہتی ہیں، اٹلی جہاں وہ اپنے ریسرچ کے لیے سفر کرتی ہیں اور پاکستان جو ان کا مادر وطن تھا۔عام فہم زبان میں بہت ساری معلومات جس میں ان ملکوں اور وہاں کے باشندوں کی خصوصیات بتاتی ہیں۔

دو خواتین سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں کا تجزیہ تاریخ وتہذیب اور زبان کے حوالے سے:

صبیحہ انور

(دیکھا ہم نے استنبول)

صبیحہ انور کے والد کا نام وجاہت علی اور والدہ کا سعیدہ بیگم ہے۔ان کے شوہر کا نام خواجہ انورالدین احمد ہے۔کرامت حسین مسلم گرلس ڈگری کالج لکھنؤ کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرار ان کا تقرر عمل میں آیا،اس کے بعد صدر شعبہ پھر کالج کی پرنسپل منتخب ہوئیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''ورق ورق زندگی''اور خواب درخواب منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح حیات'' ہے۔

ان کا سفرنامہ ''دیکھا ہم نے استنبول''2013 میں شائع ہوا۔یہ سفر انھوں نے اپنے شوہر انورالدین کے ساتھ کیا تھا۔ان کا بیٹا سیف ترکی میں ملازمت کے سلسلے میں رہ رہا تھا۔

عاشق کو جب عشق کی دولت مل جاتی ہے تو دنیا اور لوازمات دنیا اس کی نظروں میں خس وخاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔معشوق کی ایک نگاہ کے بدلے میں وہ کائنات کو قربان کرسکتا ہے:

''اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا''

ص۔150

انھوں نے ترکوں کی طرح داری وہشیاری سے باخبر بھی کیا ہے:

''کہ آنکھوں سے کاجل چرانے کے لیے صرف تیزی
نہیں بلکہ چالاکی کی بھی ضروری ہوتی ہے۔''

استنبول اس معنی میں بھی دنیا کا واحد شہر ہے جو دو براعظموں ایشیا اور یورپ کو ملاتا ہے۔ان دونوں براعظموں کو ملانے والا ابنائے باسفورس پر بنا پل عظیم سلطان فاتح قسطنطنیہ محمد کے نام سے منسوب ہے۔ ایشیائی استنبول جو اناطولیہ تک پھیلا ہوا ہے شہر کی 70 فیصد اور یوروپی استنبول جو تھریش تک پھیلا ہوا ہے 30 فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔ ایشیائی استنبول میں مقامی بازاروں کے ساتھ ساتھ تاریخی طرز کے بازار سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ اس حصے پر عثمانی دور حکومت کا اثر ہر طرف دکھائی دیتا ہے جو خوب صورت تاریخی مساجد، حسین آبشاروں اور رنگین فواروں کے علاوہ بے مثل عمارات کی شکل میں موجود ہیں۔

یوروپی استنبول بھی اپنے دامن میں بہت سے ادوار میں تعمیر کی گئی عمارتیں لیے ہوئے ہیں۔ آیا صوفیا کی مسجد جو ابتدائی دور میں ایک چرچ تھی۔ سلطنت عثمانیہ میں ایک مسجد کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھی۔ استنبول وہ شہر ہے جو ماضی کی عظیم الشان سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانیں اور دو براعظموں کی تہذیب وثقافت اپنے دامن میں سمیٹ کر دور جدید کے شوقین لوگوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ اسی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے صبیحہ انور پہنچی ہیں اور وہاں کا جغرافیہ بتاتی ہیں ترکوں کی خوبصورتی اور دلیری بھی سمجھاتی ہیں اور وہاں کے پکوان اور کباب سے روشناس کراتی ہیں:

> ''استنبول جسے شہر خوباں بھی کہا جاتا ہے، سمندر کے کنارے سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ دونوں براعظم یہیں ملتے ہیں۔ یورپ کی سرحد ایشیا کی سرحد میں گم ہوتی ہے اور وہاں سبزہ وگل کی فراوانی ہے۔ ترک خوبصورتی کے علاوہ اپنی دلیری اور جاں بازی اور طرح طرح کے ذائقوں، گوشت کے مختلف پکوانوں اور کبابوں کے لیے مشہور ہے۔''

ہندوستانی کباب کی طرح وہاں شاورما بنایا جاتا ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اسی طرح کا شاورما دبئی میں بھی بنایا جاتا ہے لیکن ترکی کے شاورما کا ذائقہ کچھ الگ ہی ہوتا ہے شاید اس وجہ سے اس کے بننے کے طریقے اور نسخہ میں فرق ہے:

> شاورما ترکی کا من بھاتا کھاجا (کھانا) ہے۔ میں شاورما کی مقبولیت دبئی میں بھی دیکھ چکی ہوں۔ شاورما بنانے کے لیے مصالحے میں Marinate کیے ہوئے گوشت کے پارچے خوب دبا دبا کر سیخوں میں پرو دئے جاتے ہیں اور چاروں طرف سے دہکتی ہوئی آنچ پر سیخوں والی چرخی دھیرے دھیرے گھومتی اور پارچوں کو سینکتی اور خوشبو اڑاتی رہتی ہے۔ شاورما تر وتازہ سلاد جس میں نیبو اور ٹماٹر کے بڑے بڑے ٹکڑے گاجر اور پدینے پر زیتون کے خوشبو دار تیل کی Seasoning ہو Serve کی جاتی ہے۔ ہم شاورما کئی بار کھا چکے تھے مگر ترکی کے شاورما کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔''

ہوٹل کے مینو کارڈ پر تحریر سامان لکھنؤ کی یاد دلاتا ہے:

کوفتہ سلطانی، کوفتہ پیازی، دلمہ ریشمی۔

شاورما اور کوفتہ سلطانی، کوفتہ پیازی، دلمہ ریشمی کے بعد ظاہر ہے کہ چائے کی ضرورت پڑتی ہے وہ ترکی کے سلیمانی چائے کے بارے میں تحریر فرماتی ہیں:

> ''شیشے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں سنہرے رنگ کی پر کیف اروما والی چائے ہے جو بغیر دودھ اور شکر کے پی جاتی ہے اور عوام میں بیحد مقبول ہے۔ شکر کی جگہ شہد کی چند بوندیں اور اوپر تیرتی ہوئی پودینے کی پتیاں اس کی رنگت اور کیف میں اضافہ کر دیتی ہیں۔''

1924 میں ترکی کو ایک نیا سر براہ ملا جس کا نام مصطفیٰ کمال اتاترک تھا۔ فروری 1925 سے مسجد کی گنبد و مینار سے اذان کی آواز بلند ہونا بند ہوگئی۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے اس مسجد کو میوزیم میں اور ترکی کو اسلامی مملکت سے ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں تبدیل کر دیا۔ کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے آج ایک بار پھر ترکی کے موجودہ صدر جمہوریہ رجب طیب اردغان نے اس میوزیم کو مسجد میں تبدیل کر دیا ہے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے کئی ایسے کام سر انجام دیے جس سے نہ صرف ترکی عوام کو تکلیف پہنچائی بلکہ دنیا بھر کے مسلمان اس سے رنجیدہ ہوئے۔ اس کی ترکی کے آئین میں سب سے ناپسندیدہ تبدیلی پردے پر پابندی اور اذان کا ترکی زبان میں دیا جانا تھا۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترقی پسندی یا جمہوریت پسندی کے جوش میں آئین میں جو تبدیلیاں کی تھیں ان میں شاید سب سے زیادہ ناپسندیدہ تبدیلی خواتین کے پردے کو غیر قانونی قرار دینا اور مسجدوں میں ترکی زبان میں اذان دینے کا حکم تھا۔
>
> عربی زبان کے جلال اور دل پذیری سے محرومی کے علاوہ ، اذان کے لیے اس زبان کے بجائے جس میں خدا نے بندے سے کلام کیا ہے، کسی دوسری زبان کا انتخاب ترکوں کے لیے بہت رنج اور اشتعال کا سبب بنا۔''

اس کے علاوہ انھوں نے اس سفرنامے میں مشہور توپ کاپی محل، پل غلطہ، جو گولڈن ہورن کے قریب ہے، مسجد سلیمانیہ، قصر خدیو جو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہے وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے استانبول کا بے حد خوبصورت منظر دکھاتی ہیں، شاہنامہ کے فردوسی کے مزار کی زیارت اور استنبول کے گرانڈ بازار کا تذکرہ بھی کرتی ہیں۔

نگار عظیم

گردآوارگی

نگار عظیم دور حاضر کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کا نام ملکہ مہر نگار ہے یہ نام انھیں علام سحر عشق آبادی نے دیا تھا جو کہ ایک مشہور عروضی تنقید نگار تھے۔ ان کے والد کا نام ثروت حسین ثروت میرٹھی ہے۔ 1976 میں ان کی شادی فن مصوری میں مہارت رکھنے والے عبدالعظیم صدیقی سے ہوئی۔ مطالعہ کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت پردے کی پابندیوں کے ساتھ ہوئی۔ انھوں نے ڈرائنگ میں ایم اے کیا اور اس کے بعد کئی ڈپلوما کورسیز بھی کیے۔ اردو سے دلچسپی تھی تو اردو میں بھی ایم کیا۔ سعادت حسن منٹو کی تخلیق اور فن سے بہت متاثر تھیں۔ ان کے سماج کو دیکھنے اور اس کو اسی شکل میں بے باکی کے ساتھ پیش کردینے کے انداز پر فدا تھیں۔ اس لیے انھوں نے منٹو کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا۔ ان کی تحقیق کا موضوع ''منٹو کا سرمایہ فکر و فن'' تھا جو کتابی شکل میں دستیاب ہے۔ 1974 سے ان کے مضامین اور افسانے لکھنے کی شروعات ہوچکی تھی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''عکس'' 1990 اور دوسرا ''گہن'' 1999 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے افسانوی مجموعے اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں اکیوریم، عمارت، طنابیں، فریم، لمحہ، گردآوارگی اور مردار وغیرہ اہم ہیں۔ دہلی کے سرکاری اسکول میں بحیثیت ڈرائنگ ٹیچر کے عہدے پر فائز رہیں۔

نگار عظیم افسانہ نگار اور شاعرہ دونوں حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ نہایت علم دوست شخصیت کی مالک ہیں۔ سفرنامہ گردآوارگی پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جمالیاتی حس بہت بیدار ہے۔ یہ سفرنامہ ان کے سفر ازبکستان پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے سفر ازبکستان کا ذکر پرلطف اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک سیاح کے طور پر دیکھا جائے تو ان کا کردار متحرک اور فعال نظر آتا ہے۔ اپنے سفر کو وہ جوش و خروش کے ساتھ مکمل کرتی ہیں:

> ''اور جب میرے قدم ازبکستان کی سرزمین پر اتر چکے تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ وہاں کی نرم و نازک نشلی البیلی ہواؤں نے میرے رخساروں کو چوم چوم کر میرا استقبال کیا تھا۔ میری نگاہیں دور آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو گئیں تھیں۔ پو پھٹ رہی تھی اور سنہرا سنہرا سورج مشرق سے اُگ رہا تھا۔ سارا منظر۔۔۔لباس میں لپٹا ہوا تھا۔ میں بہت مسحور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی ٹرمنل پر آجاتی ہوں۔''

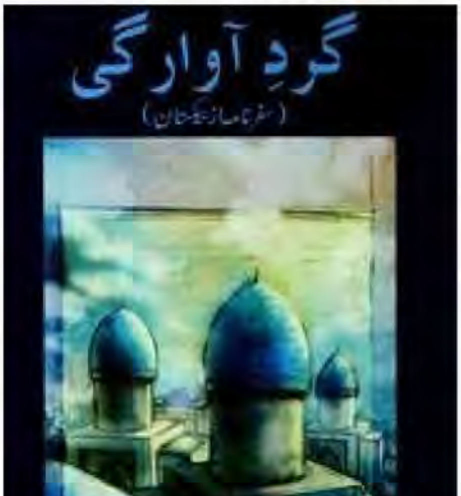

نگار عظیم ازبیکی مہمان نوازی سے خاصا گرویدہ نظر آتی ہیں۔ ہوں بھی کیوں نہیں اگر اس طرح کی مہمان نوازی ہو تو کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ نگار عظیم ازبیکی لوگوں کی مہمان نوازی، رہن سہن، عادات و اطوار کا ذکر بڑی صاف گوئی سے کرتی ہیں اور دل کھول کر ان کی تعریف کرتی ہیں۔ خشک میوے اور تازہ پھل جو ہر وقت وہاں میز پر سجے ہوتے ہیں۔ ازبیکی پلاؤ کے بنا وہاں کا کھانا مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک پلاؤ نہ آجائے کچھ نہ کچھ کھانے کو ملتا رہتا ہے۔ وہاں یہ اصول تھا کہ جس گھر میں بھی کوئی تقریب ہو قریبی خاندان کے لوگ کچھ نہ کچھ بنا کر لے آتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ کسی ایک کو پریشانی نہیں ہوتی اور کئی طرح کی ڈیشیز کا ذائقہ بھی مل جاتا ہے۔ وہاں کے کھانوں کی خصوصیات بیان

کرتے ہوئے ایک خاص قسم کی ڈش جس کا نام ''نارنگ'' ہے کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:

''کئی طرح کے ازبکی کھانے ہمارے سامنے آئے تھوڑا تھوڑا سب چکھا ہم نے۔ وہاں مرچ نہ ہونے کے برابر استعمال ہوتی ہے۔ گھی تیل بھی کم۔ بڑے بڑے پیالوں میں یخنی جیسا مشروب جس میں ہاتھ کی موٹی موٹی روٹیاں جنھیں ہمارے یہاں 'جوئے' کہتے ہیں، کسی ہوئی گاجر آلو اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، نمکین تھا۔ معلوم ہوا اس میں گھوڑے کا گوشت استعمال کیا گیا ہے۔ اس ڈش کا نام 'نارنگ' نام سنتے ہی میں نے سوچا یہاں بھی ازبکی محفلوں میں کھانے کا دور ختم نہیں ہوتا، چلتا رہتا ہے۔ ان کی گہمی رنگ اور نوعیت بدلتی رہتی ہے۔''

ازبکستانی سماج میں گھروں کی تعمیر میں ایک انوکھا اور نرالہ دستور دیکھنے کو ملتا ہے۔ ازبکستان میں رہائشگاہ کی تعمیر ایک مشکل ترین عمل ہے۔ ہمارے ہندوستان کی طرح وہاں نہیں ہوتا کہ آپ کے پاس اگر زمین ہے اور دیگر لوازمات کے لیے پیسے موجود ہیں تو آپ آرام سے ایک گھر بنوا سکتے ہیں لیکن ازبکستان میں ایسا نہیں ہوتا دکھا۔ کیوں کہ وہاں کے دستور کے مطابق مکان کا خواب دیکھنے والے کو اس کی تعمیر میں خود لگنا پڑتا ہے۔ یہاں ذاتی مکانوں کے لیے مزدور نہیں ملتے۔ اس لیے آپ کو اپنے اہل خانہ اور خانداں والوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ ایک لازمی عمل ہے اور ہر کسی کو ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔ اس ایک انسان کو گھر بنانے میں کافی لمبا عرصہ لگتا ہے۔ وہاں مکانوں کی دیواروں میں کچی مٹی کی اینٹیں استعمال ہوتی ہیں کیوں کہ مٹی گرمی کو باہر جانے سے اور ٹھنڈی ہواؤں کو اندر آنے سے روکتی ہے اور چھتیں جھوپڑی کی طرح بنائی جاتی ہیں تا کہ برف پگھل کر آسانی سے نیچے آسکے:۔

''تاشقند میں مکان بنوانا گویا جوئے شیر لانا ہے۔ وہاں راج مزدور ذاتی مکانوں کے لیے نہیں ملتے۔ ہر آدمی کو اپنا مکان خود بنانا پڑتا ہے۔ وہاں کے دستور کے مطابق عزیز رشتہ دار سب مل کر مکان کی تعمیر میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ گارے مٹی کا کام مکان مالک کو خود کرنا پڑتا ہے چاہے وہ پریسیڈنٹ ہو یا کوئی اور۔ ایسے عزیزوں کو جو اس کام میں ہاتھ نہیں بٹاتے خاندان سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ خبر ملنے پر عزیز بھاگا ہوا آتا ہے اور مکان بنانے میں اپنی مدد کرتا ہے۔ حالانکہ مالکِ مکان کو ہی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کام میں برسوں لگ سکتے ہیں۔ قمر صاحب نے بتایا کہ طاہر صاحب اس مکان بنانے میں ہی بوڑھے ہوگئے۔ ہر صاحب مکان کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں یہی دستور ہے۔''

نگار عظیم کا یہ سفرنامہ تاریخی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ انھوں نے ازبکستان کے کئی شہروں کی سیر کی اور وہاں کے تاریخی عمارتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان تاریخی عمارتوں کی اہمیت بھی بتائی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مدرسہ طلائی شیخ بڑا خاں، کبرئی چور باغ، علی شیر تھیٹر، تیمور میوزیم وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے ازبکستان کے علمی وادبی اداروں کی بھی سیر کی جہاں ان کی خوب عزت افزائی ہوئی۔

اس سفرنامے میں انھوں نے کئی ایسی ہستیوں کا ذکر کیا ہے جو واقعی اپنی علم دوستی اور مہمان نوازی کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جنھیں فراموش کرنا ممکن نہیں۔ ان میں خاص طور سے خان عبدالمجید، عبد اللہ عاریپوف، عبدالرمانوا، طاہر جان اور عزیزہ خانم، حرمت اللہ اور مناجات، تش مرزا، رماکانت، منگلا بھٹ اور دادا خان نوری وغیرہ اہم نام ہیں۔

□□□

Dr. Adila Jasim
Asst.Prof(Guest)
Deptt.Of Urdu
K.S.College, Laheriasarai
Darbhanga-846001
E.MAIL-adilajasim1991@gmail.com

اپیل

ماہنامہ خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیں۔ میگزین میں شائع ہونے والے مضامین، عنوانات اور مختلف ادبی شخصیتوں کی نشاندہی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کریں تا کہ رسالے کو مزید بہتر بنانے میں ہمیں مدد مل سکے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر شہناز یوسف

تانیثیت اور اردو افسانہ

تانیثیت کاتعلق براہِ راست عورت اوراُس کے حقوق سے ہے۔تانیثی تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کومردوں کے مقابلے میں سیاسی، سماجی،معاشرتی ،معاشی اور قانونی برابری کا حق دلانا ہے۔دراصل Feminism فرانسیسی لفظ ہے جو لیٹن لفظ femind سے لیا گیا ہے۔Feminism، feminine یا ملتا جلتا اور کوئی لفظ دراصل عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔بدلتے وقت میں اس کی مختلف تھیوری ہمارے سامنے آئی ہیں۔جن کا مقصد عام طور پر برابری کے حقوق پر زور دینا ہی ہوتا ہے۔

غرض کہ تانیثیت کے معنی ہی ہیں عورت کی زندگی سے متعلق مسائل کومختلف نظریے سے دیکھنا اور انسانیت کی کسوٹی پر پرکھ کراُس کی حیثیت اور سماج میں طے کیے اس کے مقام کا جائزہ لینا۔مغرب میں عورتوں کی زندگی اور ان کے حقوق کو لے کر کئی تحریکیں رونما ہوئیں ساتھ ہی معاشی ،سیاسی اور مذہبی سطح پر کئی تنظمیں قائم کی گئیں جن کا مقصد عورت کے فلاح و بہبود کے لیے حق کا نعرہ بلند کرنا تھا۔حقوق کی برابری کی بات کرتی اس تحریک کے متعلق دیوندراسّر رقمطراز ہیں:

''تانیثیت ایک اصطلاح ہے جس کے مخصوص معنی متعین کرنا ممکن نہیں۔یہ ایک غیر معین کثیرالمعنی تصور ہے جس میں مختلف نوع ایشوز اور رویے شامل ہیں۔مرد غالب معاشرہ اور پدری نظام سے لے کر معاشی استحصال،جنسی جبر اور دہشت تک،غیر مساوی حقوق ، سماجی ناہمواری ،قانونی عدم تحفظ،متضاد(منافقانہ) اخلاقی اقدار اور فرسودہ خاندانی / ازدواجی رشتوں سے لے کر کاروبار اور سیاسی اقتدار تک۔ اوران سب کے مرکز میں تشخص کا مسئلہ جوایسا محور ہے جس کے گرد یہ سارے مسائل مسلسل گردش میں رہتے ہیں''۔

(تانیثیت چند پہلو مشمولہ تانیثیت اور ادب،مرتبہ انور پاشا،ص:70)

جنسی برابری کے اصول پر مشتمل یہ تحریک اردو ادب میں اب سر اُٹھاتی نظر آتی ہے حتیٰ کہ انگریزی اور ہندی ادب میں اس پر بیش بہا تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ہندی ادب میں ''استری ویمرش'' ایک اہم مدعا بن کر سامنے آیا ہے جس پر کافی بحث ہوئی اور ایک نئ ادبی تحریک کا آغاز ہوا جس کا مقصد سماجی واقتصادی نظام کومزید انصاف پسند بنانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا علم بردار بننے میں کسی کوکوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ایسا نہیں ہے کہ آج کے افسانوں سے عورت غائب ہے لیکن ان کا مقصد فیمینزم کی تحریک کومدِنظر رکھ کرعورت کے حقوق کے متعلق لکھنا نہیں ہے۔اس کے علاوہ مغرب میں چل رہی اس تحریک کے مقابلے میں مشرق کے حالات کافی الگ ہیں۔یہاں آج بھی عورت پر مرد قابض ہے حتیٰ کہ مغرب کی آندھی مشرق میں تیزی سے پھیل رہی ہے لیکن ابھی یہاں فیمینزم کا تصور زور نہیں پکڑ سکتا،تو آخر تانیثی ادب کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟۔آج کے افسانہ نگاروں کے یہاں عورت تو موجود ہے لیکن اس

کے مسائل نہیں۔حتیٰ کہ خواتین قلم کاروں نے عورتوں کے نئے مسائل کو پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن ان کے یہاں بھی بغاوت کی آگ دھیمی دکھائی دیتی ہے۔ بقول نامی انصاری:۔

> ''ہندوستان کے دیہاتوں میں بسنے والی تقریباً 20 کروڑ عورتیں جو بے حد پسماندہ، ان پڑھ، گنوار اور پدری سماج کی غلام، مظلوم و مقہور ہیں، وہ آخر کس گنتی میں آتی ہیں؟ ان کے حالات کی عکاسی کے لیے اردو میں پریم چند کو چھوڑ کر کسی نے ادب تخلیق کیا ہے؟ اس کا جواب شاید ادب کا بڑے سے بڑا ترجمان بھی نہیں دے سکتا۔ پدری نظام کے اٹوٹ شکنجے میں کسی ہوئی ان خواتین کے بارے میں، جہاں تک میری نظر جاتی ہے کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس صورت میں یہ نام نہاد تانیثی ادب کس خانے میں فٹ بیٹھتا ہے''۔

(تانیثی ادب کے اطراف مشمولہ تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، ص:87)

غرض کہ ہمارے سامنے عورتوں سے متعلق کئی موضوع بکھرے پڑے ہیں لیکن ان کی طرف کوئی اپنی توجہ مرکوز کرتا نظر نہیں آتا ہے۔

حالانکہ اس سے قبل ترقی پسند تحریک تک عورت اور اُس کے مسائل اردو افسانے میں جگہ پاتے نظر آئے ہیں۔ اردو ادب میں تانیثیت کی بات کریں تو افسانے میں رشید جہاں کی آمد کے ساتھ ہی عورتوں کے حقوق اور اُن کے جامع تصور کو پیش کیا۔ وہ پہلی افسانہ نگار خاتون تھیں جنھوں نے سماجی و انقلابی حقیقت نگاری سے کام لیا اور جس کی روش پر آگے عصمت چغتائی چلتی نظر آئیں۔ عصمت نے عورت کی انسانی حیثیت کو پہچاننا اور اُس کے حق کے لیے آواز بلند کی۔ عصمت نے اس بات پر زور دیا کہ عورت پہلے فرد ہے باقی سب بعد میں۔ اس ذہنیت پر منٹو نے بھی قلم اُٹھایا اور دونوں نے مل کر عورت بطور ایک جنسی معروض کے مٹا کر ایک الگ شخصیت عطا کی۔ اس کے بعد قرۃ العین حیدر کے یہاں بھی عورت کا ایک نیا تصور اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو ادب میں حال ہی میں تانیثیت کی لہر چلی ہو یا پھر عورتوں کے مسائل پر اس سے قبل لکھا نہ گیا ہو، کیونکہ اگر ہم فکشن کی تاریخ پر غور کریں تو نذیر احمد سے لے کر ترقی پسند افسانہ نگاروں تک ہر فنکار نے بڑی بے باکی سے عورتوں کے مسائل کو ظاہر کیا ہے۔ جدیدیت کے ساتھ عورت اور اس کے مسائل افسانے سے غائب ہو گئے اور آج اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں کے یہاں عورت محض ضمنی کردار کے طور پر نظر آتی ہے۔ اس دور میں کوئی ایسا افسانہ نظر نہیں آتا جو اکیسویں صدی کی عورت کے Genuine مسائل کی غمازی کرتا ہو۔ یقیناً ادب کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لیکن جس طرح مرد حضرات تخلیق و تنقیدی میدان میں خواتین قلم کاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یعنی کہ عہدِ حاضر میں Women equality ایک نعرہ بن گئی ہے جس کی عملی میدان میں کوئی جگہ نہیں۔

بہرحال اردو افسانے میں نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں تانیثیت کے رجحان دیکھے جا سکتے ہیں حالانکہ ان کے یہاں متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں یعنی کہ سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور علاقائی مسائل پر بھی خواتین قلم اُٹھا رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی شہر میں رہنے والی تعلیم یافتہ عورت جن مسائل سے دوچار ہوتی ہیں جہاں گھریلو زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے درمیان آنے والے مختلف مرحلوں کو پار کرتی عورت کی تصویر کی پیش کش بڑی ہنرمندی سے کرتی نظر آتی ہیں۔

اس ضمن میں غور کریں تو ذکیہ مشہدی فکشن نگاروں میں ایک معتبر نام مانا جاتا ہے۔ انھوں نے عورتوں کی زندگی اور مسائل کو بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ اُن کا افسانہ ''تھکے پاؤں'' اس اعتبار سے اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ افسانے میں رتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے جس نے اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے عمر کی بھی پرواہ نہیں کی۔ جیسا کہ ہندوستانی روایت ہے کہ بیٹی کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اُس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور اسی سماجی نظام اور ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے درمیان کنواری رتنا کی زندگی افسانے کا اہم موضوع ہے۔ ایک عورت کی زندگی شوہر اور بچوں کے بغیر بے معنی تصور کی جاتی ہے لہٰذا اسی ذہنیت کی عکاسی افسانے میں کی گئی ہے۔ رتنا وہی تمام باتیں ہر مرتبہ عورتوں کی تکریب میں سنتی آ رہی تھی:

> ''کتنی یکساں ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ چہرے اس کے لیے اجنبی تھے لیکن باتیں اجنبی نہیں تھیں۔ یہ باتیں وہ ہر جگہ سنتی آئی تھی۔ اسٹاف روم میں، گھر پر، شادی بیاہ، منگنی، سالگرہ ہر تقریب میں عورتیں بس یہی باتیں کرتی نظر آتی تھیں۔ میرا گھر، میرے بچے، اچار کی ترکیبیں، مٹھائیوں کے نسخے، شوہر کی محبت یا بے اعتنائی''۔

(مجموعہ پرائے چہرے، از ذکیہ مشہدی، ص:20،21)

غرض کہ رتنا کو ان سب کے درمیان اپنی زندگی گزارنا بے حد مشکل معلوم ہوتا تھا۔ افسانے میں رتنا کے ساتھ ساتھ صوفیہ کے ذریعے مڈل

کلاس لڑکیوں کی زندگی میں ہونے والی تگ ودو کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔صوفیہ کے منگیتر کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرا پر کلاس میں شادی کر لینا صوفیہ کو اپنے سے کم عمر لڑکے سے رشتہ قائم کرنے کی طرف راغب کر دیتا ہے وہیں رتنا صوفیہ کا یہ فیصلہ سُن کر ادھیڑ عمر کے رنڈوا مرد کے بارے میں فیصلے لینے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے میں اس ادھیڑ عمر کے مرد کی ذہنیت کو بھی بخوبی اُجاگر کیا ہے جو دو لڑکیوں کا باپ ہے اور رتنا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ رتنہ کو لکھا اُس کا خط مردانہ ذہنیت کی بہترین عکاسی کرتا ہے:۔

''یہ میرا آخری خط ہے۔اس کا جواب پندرہ دن کے اندر مل جانا چاہیے۔ ورنہ میں کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈھنا شروع کر دوں گا۔ دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ دو ہفتے میں فیصلہ کر لو۔ پھر چاہے خط لکھ دینا چاہے فون کر دینا''۔

یہ ہے وہ رویہ جو ہمارے سماج اور خاص طور سے اس میں حکمرانی کرنے والے مردوں کی سوچ کو اُجاگر کرتا ہے۔

افسانہ ''تیسری راکھی'' ایک طلاق شدہ عورت ارونا کی کہانی ہے جس کا اپنے ہم عمر مردوں کے ساتھ گھومنا اُس کے کیرکٹر لیس ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے۔افسانے میں ارونا کے ساتھ گھومنے پھرنے اور محبت کا دعویٰ کرنے والے ستیش کی رائے ملاحظہ کیجئے:۔

'She is good sport'۔اس نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔مجلسی لڑکی ہے، خوب ہنستی بولتی ہے جہاں کہو ساتھ جانے کو تیار۔ مگر اب اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں جھوٹی تھالی پر بیٹھ جاؤں''۔

یہ ہے مردانہ فطرت جو عورت کو محض سیر و تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔اسی کے برعکس افسانہ ''ٹوٹا ہوا خط'' تنہا رہ چکی ایک عورت دیوکی کی کہانی ہے جس کی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور بیٹا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ پھر بھی اپنے بچوں کے خاطر ہر وقت پیسے جمع کرنے والی ایک ماں کی ممتا کی کہانی ہے۔

افسانہ ''حصار'' ایک عورت کے دبے کچلے جذبات کے پھر زندہ ہو جانے کی کہانی ہے۔افسانے میں اپنے ماں باپ کی محبت کو قربان کرنے والی بیٹی اور آگے چل کر اپنے بیٹے کی خوشی کے خاطر اپنے جذبات کا گلا گھوٹنے والی فرح کی کہانی ہے۔افسانے میں شوکت کا اپنی ماں کے پہناوے کو لے کر طنز کرنا سماج کی اس ذہنیت کی علامت ہے۔ جس میں ہر مرد ایک بندھا ٹکا نظریہ عورت کے لیے رکھتا ہے پھر وہ چاہے شوہر ہو والد ہو یا بیٹا۔ دیکھیے یہ اقتباس:۔

''ممی آپ شلوار کرتا کیوں نہیں پہنتی ہیں؟۔

وہ بہت زور سے چونکیں ۔شوکت نے ان کے پہننے اور اوڑھنے کے معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔اس کا خیال تھا ممی بہت ہی خوش پوش، جامہ زیب اور باذوق خاتون ہیں ۔۔۔۔میں کیا پہنتی ہوں کیا نہیں ۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میرے لباس کبھی حیا اور وقار کی حدود سے آگے نہیں بڑھے۔انھوں نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔

'' ماں ۔آپ صرف ساڑی پہنا کیجئے اور ڈھیلا سا جوڑا بنایا کیجئے۔ باقی اسٹائل اب آپ کو زیب نہیں دیتے۔ شوکت نے ان کے لہجے کی درشتگی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا''۔

(افسانہ حصار مشمولہ صدائے بازگشت، از ترنم ریاض، ص:87،86)

یہی نہیں بلکہ اپنی پسند سے شادی کرنے والا شوکت اپنی ماں کی زندگی میں آئے شخص احسن کو قبول نہیں کر پاتا ۔افسانے کا اختتام کافی دلچسپ انداز میں ہوتا ہے جہاں ایک عورت ماں کے فریضے سے اوپر اُٹھ کر ایک فیصلہ لیتی ہے:۔

''دوسرے دن انتہائی اعتماد کے ساتھ وہ احسن فیاض کے کیبن میں داخل ہوئیں اور ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بولیں۔ احسن، ہم شادی کر رہے ہیں''۔

یہ ہے عورت کا وہ احتجاجی روپ جس کی اس صدی کو ضرورت ہے۔ غرض کہ اپنے افسانوں میں ذکیہ مشہدی نے جہاں تعلیم یافتہ عورت کے مسائل کو پیش کیا ہے وہیں اپنے بچوں کی خاطر سب قربان کرنے والی گاؤں کی عورت کا کردار بھی پیش کیا ہے۔افسانہ ''نیا سال مبارک ہو'' جہیز کی لعنت کے خلاف لکھی ایک عمدہ کہانی ہے جس کے شکنجے میں پھنس کر آج بھی ہندوستان کی کئی لڑکیاں اپنی زندگی گنواتی نظر آتی ہیں۔

نسائی زندگی کا بیان کرنے والی خواتین میں ایک اور اہم نام ترنم ریاض کا بھی ہے جن کے یہاں کشمیر کے ساتھ ساتھ علاقائی مسائل کی پیش کش نے انھیں ادب میں اہم مقام دلایا ہے۔ترنم ریاض کے یہاں عورت مشرقی تہذیب کی نمائندگی کرنے کے ساتھ بغاوت کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔افسانہ ''ہم تو ڈوبے صنم'' اسی قسم کا افسانہ ہے ۔افسانے میں نادیہ اپنے شوہر کے ہر ظلم کو برداشت کرتی ہے حتیٰ کہ ایڈس ہو جانے کے بعد بھی شاہد کا رویہ تبدیل نہیں ہوتا۔ دیکھئے یہ اقتباس جہاں وہ ہر وقت نادیہ کے ساتھ بدسلوقی و کڑوے لہجے کا استعمال کرتا دکھائی دیتا ہے:۔

''تم کیا تیمارداری کا ڈھونگ رچاتی ہو۔۔۔انتظار میں ہوگی

کہ میں مروں اور تم جلد سے جلد دوسری شادی کرو"۔ایک دن نادیہ کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے شاہد نے کہا۔

"مگر یاد رکھنا۔۔۔۔تم سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔سب جانتے ہیں کہ تم دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔

بانجھ ہو تم بانجھ۔۔۔سمجھیں؟اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور نادیہ اُسے پل بھر دیکھنے کے بعد کسی کام میں مشغول ہو گئی"۔(مجموعہ یمبرزل، از ترنم ریاض، ص:80،81)

غرض کہ موت کی آغوش میں ہونے کے بعد بھی شاہد کا رویہ تبدیل نہیں ہوتا۔مسوڑوں سے خون رسنے کی وجہ سے نادیہ اس سے تھوڑی دوری اختیار کر لیتی ہے لیکن ایک مرتبہ جب شاہد اُسے اپنی طرف کھینچ کر دانت سے کاٹنا چاہتا ہے تو نادیہ یہ عمل برداشت نہیں کر پاتی اور اُسے دھکا دے کر بھاگ جاتی ہے۔غرض کہ ترنم ریاض کے یہاں انسانی رشتوں کے درمیان سانس لیتی عورت کی نفسیات کی بہترین عکاسی کی ہے۔بقول حقانی القاسمی:۔

"ان کی تخلیق سے جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایسی عورت کی ہے جس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے لبالب پیالہ ہے"۔۔۔۔ترنم ریاض کی کچھ کہانیوں میں مردانہ جبر کے خلاف ہلکی سی آہٹ تو ملتی ہے مگر وفاداری بشرط استواری کی فضا قائم و دائم رہتی ہے"۔

(مجموعہ یمبرزل، از ترنم ریاض، ص183)

نگار عظیم کا نام بھی عہدِ حاضر میں اپنی نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ ان کے موضوعات متوسط طبقے سے نکل کر آتے ہیں۔نگار عظیم کے یہاں افسانہ "گہن" بھی جدید دور کی بدلتی لڑکیوں کی زندگی اور فیشن پرستی کے نام پر عریاں جسم کے چلن کی طرف ہماری توجہ دلاتا ہے۔غرض کہ نگار عظیم کے یہاں تانیثیت کے نام پر محض عورت عورت کی آواز نہیں گونجتی۔دراصل نگار عظیم نے جہاں عورت کا ذکر کیا ہے وہاں مظلومیت کی جگہ بغاوت کی لہریں اُٹھتی دکھائی دیتی ہیں۔افسانہ "حصار" اس کی بہترین مثال ہے جہاں زاہدہ اپنی بیٹی کو پڑھانے کے لیے شوہر کی بغاوت پر اُتر آتی ہے۔دیکھئے یہ اقتباس:۔

"تھپڑ کھانے کے بعد زاہدہ سنبھلی۔اور اپنی تمام قوت بٹور کر وہ دہاڑی۔بس۔خاموش۔ہاتھ میرا بھی اُٹھ سکتا ہے۔میری بیٹی پڑھے گی ضرور پڑھے گی"۔

(مجموعہ گہن، از نگار عظیم، ص:10)

افسانے میں زاہدہ کی یہ ہمت دیکھ کر شوہر بھی بھونچکا رہ جاتا ہے۔ افسانہ سماج میں آئی تبدیلی کی دلیل ہے جہاں عورت حق کی آواز اُٹھاتی ہے۔آج شادی کے مقابلے کیریئر کو اہم مقام دیا جاتا ہے۔

سماج میں آئی اس تبدیلی کی عکاسی شائستہ فاخری بھی کرتی ہیں۔ ان کا افسانہ "سنو رقیہ باجی" تانیثی تحریک کی مسلم خاتونِ اول رقیہ سخاوت حسین کے نام منسوب ہے۔بقول گوپی چند نارنگ:۔

"اس افسانے میں کرداروں کی ذہنی کشمکش نے ایسی فضا تیار کی ہے کہ صورت واقعہ سے تحیر پیدا ہوتا ہے۔میڈم سارا کیچی کی زبان کہے گئے جملے ایک عورت کا دوسری عورت کے ساتھ ناروا رویوں کی کھلی نشاندہی کرتے ہیں۔کیا یہ آج کا سچ نہیں ہے"۔

(مجموعہ اداس لمحوں کی خود کلامی، از شائستہ فاخری، ص:15)

افسانے میں سلطانہ کے خواب چرانے کے جرم میں واحد متکلم کو اذیت ناک سزائیں دی جاتی ہیں۔دراصل افسانے کا اصل موضوع عوررت کی اس تکلیف کا بیان کرنا ہے جہاں وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے بسر کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔

شائستہ فاخری کا افسانہ "اداس لمحوں کی خود کلامی" کافی حد تک عصمت کے لحاف سے مماثلت رکھتا ہے۔افسانے میں زینی نام کی لڑکی کے ذریعے ایسی لڑکیوں کی تصویریں پیش کی ہے جو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے مردوں کا سہارا نہیں لیتی۔افسانے میں مومنہ ہوسٹل اور اُس میں رہنے والی لڑکیوں کی زندگی کا خاکہ کھینچا گیا ہے جن کو مذہب کے نام پر اس قدر قید کر دیا ہے کہ اُن کی زندگی میں روشنی کا کوئی گزر نہیں ہے۔زینی الگ مزاج کی لڑکی تھی جس کے متعلق شائستہ فاخری رقمطراز ہیں کہ:۔

"باہر کی دنیا میں یہ مرد عورت نام کی تتلی بنا کر اُڑانا چاہتے ہیں اور گھر کے اندر یہی مرد عورت کو جھینگر کی زندگی دے کر اندھیرے میں دھانس کر مارنا چاہتے ہیں۔اسے یہ دونوں ہی زندگی نہیں چاہئیے۔اسے ایک تیسری زندگی کی تلاش تھی اور ایک دن یہ تلاش بھی ختم ہوئی"۔(ایضاً ص:87)

افسانے میں زینی ایک Inanimate پنک پینتھر کو پاس سلا کر نیند کی آغوش میں کھو جاتی تھی۔ایک بے جان سی چیز بھی ایک جوان لڑکی کی تمام خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بن چکی تھی۔مذہبی پابندی کے پہرے کو توڑنے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔افسانے کا مرکز ادھوری جنسی خواہشات کو

بنایا ہے۔افسانے میں ایک موڑ ایسا آتا ہے جب لڑکیوں کے درمیان سے پینتھر ہٹ جاتا ہے۔افسانے میں روبینہ اور ذینی کی انھیں نزدیکیوں کا بیان ڈھکے چھپے انداز میں کیا ہے اور جب یہ خواہشات پوری نہیں ہو پاتی تو روبینہ کی موت ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ افسانہ اپنے اندر ایک المناک داستان سمیٹے ہوئے ہے۔یقیناً جنسی موضوعات پر نہ بس قلم اُٹھانا بلکہ اُس کے ساتھ انصاف کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔شائستہ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عورت کے اندرون میں جھانک کر اُس کی نفسیاتی الجھنوں کو سمجھنے اور پُر اثر طریقے سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔بقول صغیر افراہیم:۔

''شائستہ فاخری نے اس عہد کی عورت ہونے کا کفارہ ادا کرنے کے لیے جو خوبصورت افسانے لکھے ہیں وہ اس عہد کے بھیانک سچ ہیں جو دلوں میں خوف کے صلیب بن کر لٹک رہے ہیں''۔

(چہارسو: شائستہ نمبر vol-024 ص:56)

اردو کے افسانوی ادب میں ایک افسانوی مجموعے کے باوجود اپنی جگہ بنانے میں ثروت خان کا نام بھی اہم ہے۔اُن کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ راجستھانی کلچر، نظریات اور زبان کا بھی رنگ چھلکتا ہے۔اُن کا ایک افسانوی مجموعہ ''ذرّوں کی حرارت'' منظر عام پر آ چکا ہے۔اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''میں مرد مار بھلی'' میں عورتوں کی نفسیات، اُن کے متضاد رویوں اور ازدواجی زندگی کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ ''زندگی اور موت'' میں عورت کا سب سے اہم خصوصیت یعنی کہ ماں کی ممتا کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔اس کے علاوہ ''تقرّر''، ڈرائی ڈیکوریشن، مردانگی، حسن کا معیار وغیرہ افسانے بھی عورتوں کے مسائل اور تانیثی رجحان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔کہیں کہیں وہ عورت کو مرد سے زیادہ طاقتور دکھانے میں بھی گریز نہیں کرتیں۔

غزالہ ضیغم کا افسانہ ''سوریہ ونشی چندر ونشی'' نئے زمانے کی تعلیم یافتہ لڑکی روحی خان کی کہانی ہے جو زمیندارانہ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اُن کی مخالفت کر قانون پڑھتی ہے۔ساتھ ہی اپنی شادی سے لے کر کیریئر تک ہر فیصلہ خود کرتی ہے۔افسانے میں جا بجا روحی کی باغیانہ تقریر سننے کو ملتی ہے۔افسانے میں ایک جگہ وہ اپنے بھائی پر بگڑ کر کہتی ہے:۔

''یہ میں کیسے مان لوں کہ لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ یہی جاننے کے لیے تو میں قانون پڑھوں گی''۔

(مجموعہ ایک ٹکڑا دھوپ، از غزالہ ضیغم، ص:19)

اسی مانند افسانہ ''نیک پروین'' میں صبر وتحمل کا دامن پکڑ کر رکھنے والی ایک عورت کے آخر میں خاموش احتجاج کرنے کی کہانی ہے۔

ان کے ساتھ بھی اور کئی خواتین افسانہ نگار ایسی ہیں جن کے یہاں عورت کے مسائل کے ساتھ ساتھ اُس کا باغیانہ روپ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تانیثی تحریک عورتوں کے لیے انصاف کی طالب اور معاشرے میں رائج مختلف امتیازات کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے لیکن کوئی بھی تحریک تحریک کی صورت تب اختیار کرتی ہے جب ہر فرد اُس میں شامل نظر آئے۔پھر ایک غور طلب سوال یہ بھی ہے کہ کیا کوئی مسائل کسی تحریک کی شکل اختیار کر کے ہی ادب وسماج میں اپنی جگہ پاتے ہیں؟ کیا بغیر تحریک کے سماج میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے یہ گھنونے معاملات تخلیق کار کے ذہن ودل پر چوٹ نہیں کرتے؟ بلاشبہ آج عورت مرد کے مقابلے میں کھڑے ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس میدان میں کتنے روز ٹک پاتی ہے؟ آج گھر کی چاردیواری کو لانگھ کر کھلی ہوا میں سانس لینے کی آزادی تو اُسے حاصل ہو گئی ہے لیکن اُسی فضا میں گردش کر رہے بے شمار ناپاک حوصلوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت اُس میں اب بھی نہیں ہے۔

موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ مرد حضرات خواتین کو نظر انداز کر رہے ہیں (بطور فنکار نظر انداز کیا جانا ایک الگ بحث طلب موضوع ہے) اگر ایسا ہوتا تو نذیر احمد اور پریم چند کے افسانوں میں عورت جگہ نہیں پاتیں، عظیم بیگ چغتائی پردے میں لپٹی عورت کے حق کی آواز نہیں اُٹھاتے، منٹو ایک طوائف میں چھپی عورت کی تلاش نہیں کرتے بلکہ فکر یہ ہے کہ موجودہ دور میں بدتر ہو چکے حالات اور معاملات کے درمیان اپنے وجود کی تلاش میں کھڑی عورت کے احساسات کی ترجمانی کس حد تک کی جا رہی ہے، پھر چاہے وہ مرد کرے یا عورت۔اُس کے درد واشکوں سے لبریز خاموش سسکیاں فنکار کے جود کو متاثر کرتی ہے یا نہیں؟ ان تمام سوالات پر غور کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں عورت کو در پیش آنے والے مسائل کی نشاندہی کر تانیثی شعور پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جا رہی ہے۔

ShahnazYusuf
528/33, Chipacolony, O.T.C Scheme
Mullatalai,Udaipur-313001 (Rajasthan)
Mob no. 9636433832\9057471104
Email: zubeida.s.shahnaz@gmail.com

ڈاکٹر شبیر احمد

خواتین کی بااختیاری اور سماجی ترقی میں تعلیم کی اہمیت

تعلیم کے ذریعہ بنیادی انسانی حقوق کی آگہی حاصل ہوتی ہے اور یہ سماجی تبدیلی کا حامل ہے، خاص طور پر خواتین کی معاشی اور سماجی ترقی میں مددگار ہے۔ خواتین کی معاشی اور سماجی ترقی کے بنا سماج ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔ دنیا بھر میں جنسی امتیازات کا مقابلہ کرنے، خواتین کو معنی خیز زندگی گزارنے اور سماجی ترقی میں تعاون کرنے میں تعلیم تک رسائی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔تعلیم ایک آلہ ہے جس کے ذریعے خواتین کو سماج میں موجود جنسی تعصب کا سامنا کرنے، اپنے حقوق حاصل کرنے، اور سماجی تبدیلیوں میں فعال شرکت کی راہ آسان ہوتی ہے۔علاوہ ازیں، تعلیم خواتین کو روایتی اور فرسودہ حدود سے آزاد ہونے کی مفاہمت فراہم کرتی ہے، اقتصادی آزادی کی نشانی بنتی ہے اور وسیع سماجی اقتصادی ترقی کا حصہ بنتی ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم بااختیار بنانے کی ایک روشنی کے طور پر کھڑی ہے، صنفی مساوات اور سب کے لیے ایک زیادہ جامع، خوشحال مستقبل کی طرف راہیں روشن کرتی ہے۔

تعلیم خواتین کو مختلف جہات میں زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے ضروری علم، مہارتوں، اور تنقیدی سوچ کی صورت میں ایک تبدیلی پیدا کرنے والی طاقت کے طور پر کام کرتی ہے۔تعلیم حاصل کرنے سے، خواتین کو مختلف شعبوں میں خود اعتمادی اور مہارتوں کے ساتھ مختلف پہلوؤں کو بھروسے اور ماہرانہ طریقے سے چلانے کے لیے ضروری دانشورانہ آلات حاصل ہوتے ہیں۔ یہ خود مختاریت محض تعلیمی قابلیت سے آگے بڑھ کر خواتین کے اندر خود مختاری سے باخبر فیصلے کرنے اور اپنے حقوق کو دوسرے کے سامنے بے مدعا کرنے کی صلاحیت پیدا کر ہے۔تعلیم کے نظریے سے، خواتین اپنی ذاتی صلاحیتوں اور حقوق کی گہری وسعت پر شدید آگاہی حاصل کرتی ہیں، جو انھیں تاریخی طور پر ان کی توانائی کو محدود کرنے والے روایتی جنسی معیارات کو متزلزل اور ختم کرنے کی حوصلہ افزائی فراہم کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، تعلیم ذاتی ترقی کے لیے ایک کیمیائی ترکیب کا کردار ادا کرتی ہے، جو خواتین میں اعتماد کو پرورش دیتی ہے، اس طرح انھیں شخصی اور پیشہ ورانہ علاقوں میں قائم رہنے اور یقین کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صلاحیت فراہم ہوتی ہے۔ جب خواتین تعلیم کے ذریعے علم اور مہارت حاصل کرتی ہیں، تو وہ اپنی موجودگی کا دعویٰ کرنے، اپنے خیالات کا اظہار کرنے، اور سماجی داستانوں کو شکل دینے میں فعال شریک ہونے کے لیے بہتر طریقہ سے آمادہ ہوتی ہیں، جو جنسی برابری اور اختیارات حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

اقتصادی استحکام خواتین کی تعلیم کا ایک اہم پہلو ہے، جو انھیں معاشی استقلال اور ترقی کا دروازہ فراہم کرتا ہے۔تعلیم کے ذریعے، خواتین وہ مختلف مہارتوں اور صلاحیتوں کی مالک بنتی ہیں جو انھیں معاشی افعال کے مواقع تک رسائی فراہم کرتی ہیں۔اس علم کے ساتھ، وہ زیادہ

بہتر کارکردگی حاصل کرسکتی ہیں، اس طرح اقتصادی اعتمادی کی بنیادی طور پر موقوف ہوتی ہیں اور اپنا معاشی مستقبل محفوظ کرتی ہیں۔ متعدد مطالعات اور تحقیقات باضابطہ طور پر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ خواتین مزید کامیابی سے مشغول ہوتی ہیں، اور تعلیمی حصول کے ساتھ اپنے ہم منصبوں کے مقابلے میں زیادہ اجرت حاصل کرتی ہیں۔ ذاتی فائدے کے علاوہ، خواتین کی اقتصادی استحکام وسیع تر سماجی اور اقتصادی حرکیات کے لیے اہم مضمرات رکھتی ہے۔ جب تعلیم یافتہ خواتین فعال طور پر معاشی سرگرمیوں میں شامل ہوتی ہیں، تو وہ گھریلو آمدنی میں شراکت داری کرتی ہیں، اس طرح زیادہ مالی استحکام اور مضبوطی فراہم ہوتی ہے۔ مزید برآں، معاشی سرگرمیوں میں ان کی موجودگی پیداواری صلاحیت کو بڑھا کر اور جدت طرازی کو فروغ دے کر معاشی ترقی کو ہوا دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین کی معاشی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر، معاشرے خوشحالی اور ترقی کی نئی راہیں کھول سکتے ہیں، اس طرح تمام حصہ داروں کے لیے ایک زیادہ جامع اور متحرک معیشت تشکیل دے سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں، تعلیم میں برابری کو فروغ دینے اور سماجی تبدیلی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین تبدیلی کے زوردار نمائندے کی طرح سامنے آتی ہیں، جو علم واعتماد کے ساتھ تمغہ لے کر جارحیت کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں، تاکہ تشدد آمیز روایتوں کو متاثر کیا جاسکے اور اپنے حقوق کا حمایتی بن سکیں۔ وہ سیاسی اور شہری میدانوں میں سرگرم رہنے کی زیادہ رغبت رکھتی ہیں، اپنی آوازوں کو بلند کرکے انصاف اور برابری کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ فعال شراکت مندی انداز میں سماجیت میں مزید شامل اور جمہوریت پسند معاشرے کے بننے میں مدد فراہم کرتی ہے، جہاں مختلف نقطہ نظر کی قدر کی جاتی ہے اور آواز سنی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں، تعلیم خواتین کو اہم مسائل جیسے تولیدی صحت، جنسی تشدد، اور ماحولیاتی مستقلی کے اوپر اہم گفتگوؤں کا سرپرست بناتی ہے۔ ان مسائل کی دقیانوسی سمجھ کے ساتھ، تعلیم یافتہ خواتین مثبت سماجی تبدیلی کے کے لیے عمل انگیز ہیں، جو کمیونٹی کی تحریک کرتی ہیں اور نظامی بے انصافیوں کا حل کرنے کے لیے پالیسی کی اصلاحات کی حمایت کرتی ہیں۔ ان کی قیادت اور حمایت کی کوششوں کے ذریعے، تعلیم یافتہ خواتین سماجی عقائد اور ساختوں کو دوبارہ شکل دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور مستقبل کے لیے راہیں ہموار کرتی ہیں۔

خواتین کی تعلیم میں سرمایہ کاری کے گہرے اور دیرپا فوائد کو زیر تاکید رکھنا اہم ہے، جو کہ اندراج وسپرداری کے لیے ایک بہتر مستقبل ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ نسلوں کے درمیان غربت کے دور کو توڑنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تعلیم تک رسائی سے، خواتین اپنے بچوں کی تعلیم اور صحت میں سرمایہ کاری کرنے کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں، اس طرح اوپری خوشحالی اور معیشتی بہتری کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ یہ تذویری سرمایہ کاری نہ صرف انفرادی خاندانوں کو بلکہ معاشرتی بنیادوں کو مضبوط بناتی ہے۔ علاوہ ازیں، خواتین کی تعلیم کا تعلق کم بچوں کی تعداد، بہتر بچوں کی غذائیت، اور بہتر ماں اور بچے کی صحت کے نتائج کے ساتھ ہوتا ہے۔ خواتین کو علم اور وسائل فراہم کرکے ان کو ان کی تولیدی صحت اور بچوں کی دیکھ بھال کے بارے میں مطلع فیصلے کرنے کی صلاحیت فراہم کرنے سے، تعلیم کو کل عائلی بہتری میں ایک زوردار اوزار بناتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ خواتین کی تعلیم کو ترجیح دینا وسیع تر عالمی ترقیاتی ایجنڈوں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، بشمول پائیدار ترقی کے اہداف (Sustain-able Development Goals)۔ تعلیم کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنا کر، ممالک صنفی مساوات، غربت کے خاتمے، اور معیاری تعلیم سے متعلق SDGs کے حصول کی طرف اہم پیش رفت کرتے ہیں۔ اس طرح، خواتین کی تعلیم میں سرمایہ کاری نہ صرف ایک اخلاقی ضرورت کے طور پر ابھرتی ہے بلکہ مزید لچکدار، مساوی، اور پائیدار معاشروں کی تعمیر کے لیے ایک اہم راستے کے طور پر بھی ابھرتی ہے۔

مختلف روایتی فرق، مضبوط جنسی تعصبات، اور معاشی اختلافات کی موجودگی کی وجہ سے، خواتین کی تعلیم تک رسائی میں مختلف رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے جو دنیا بھر میں ان باتوں کے بنیادی فرق کو جاری رکھتے ہیں۔ غربت عموماً خاندانوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر مرد کی تعلیم کو ترجیح دیں، اس طرح غربت عدم مساوات کے دائمی چکر کو جاری رکھتی ہے۔

علاوہ ازیں، مختلف علاقوں میں محدود بنیادی ڈھانچہ اور وسائل کی کمی کی وجہ سے مختلف علاقوں میں عورتوں کے لیے دستیاب اور معیاری تعلیم کی فراہمی کے مسئلہ کو بڑھا دیتی ہے۔ ان پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنے کے لیے، ایک کامیاب منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے جس میں پالیسی کے اصلاحات، ہدف کو حاصل کرنے کے لیے سرمایہ کاری، اور کمیونٹی کی شراکت شامل ہوتی ہے۔ حکومتوں کو تعلیم کو بنیادی انسانی حق کے طور پر ترجیح دینا چاہیے، اور ایسی پالیسیاں نافذ کرنا چاہیے جو صنف سے قطع نظر معیاری تعلیم تک عالمی رسائی کی ضمانت دیتی ہوں۔ اس کے

لیے تعلیمی ڈھانچہ کو بڑھانے، قابل اساتذہ کی بھرتی، اور ضروری تعلیمی مواد فراہم کرنے کے لیے کافی وسائل مختص کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں، کوششوں کو تعلیمی اداروں میں صنفی بنیاد پر امتیاز کے خاتمے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے، ایسے ماحول کو فروغ دینا چاہیے جو لڑکیوں کے اندراج اور برقرار رکھنے کے لیے سازگار ہوں۔ اس میں مثبت اقدامات کو عمل میں لانا شامل ہے، جیسے اسکالرشپ اور محرکات، تعلیم میں لڑکیوں کی شرکت کو بڑھانے کے لیے۔ علاوہ ازیں، کمیونٹی کا مشارکت نقائص فہمی اور لڑکیوں کی تعلیم کی قدر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مقامی لوگوں ،بشمول والدین، کمیونٹی رہنماؤں، اور ماہرین تعلیم کو متحرک کرکے، لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کے بارے میں بیداری پیدا کرنے اور بنیادی سماجی و ثقافتی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ مزید برآں، تعلیم تک مساوی رسائی کو یقینی بنانے کے لیے پسماندہ برادریوں، بشمول دیہی اور مقامی آبادیوں کو ہدفی مدد فراہم کی جانی چاہیے۔ اس میں دور دراز علاقوں میں اسکولوں کا قیام، نقل و حمل میں مدد فراہم کرنا، اور پسماندہ گروہوں کو درپیش مخصوص مسائل سے نمٹنا شامل ہے، جیسے زبان کی رکاوٹیں یا ثقافتی حساسیت۔ بالآخر، خواتین کی تعلیم کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے اور دنیا بھر میں لڑکیوں اور خواتین کی مکمل صلاحیتوں کا ادراک کرنے کے لیے حکومتی کارروائی، کمیونٹی کی شرکت، اور بین الاقوامی تعاون پر مشتمل ایک مشترکہ کوشش ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم خواتین کو بااختیار بنانے اور سماجی تبدیلیوں کو کرنے اور اپنانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اس کا اثر افرادی بہتری سے آگے بڑھ کر، کمیونٹی اور معاشرے میں بڑے پیمانے پر پھیلتا ہے۔ خواتین کی تعلیم میں سرمایہ کاری کو ترجیح دے کر، ہم نصف آبادی کی پوشیدہ صلاحیت کو سامنے لاتے ہیں، اس طرح سب کے لیے ایک زیادہ جامع، متحرک اور مساوی مستقبل کو فروغ دیتے ہیں۔ تعلیم خواتین کو بااختیار بناتی ہے کہ وہ نظامی رکاوٹوں سے آزاد ہو کر انھیں اپنی خواہشات کا ادراک کرنے اور سماجی ترقی میں بامعنی کردار ادا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے، خواتین صنفی اصولوں کا مقابلہ کرنے، اپنے حقوق کی حمایت کرنے، اور اپنی برادری کی سمت کو تشکیل دینے میں فعال طور پر حصہ لینے کے لیے ضروری مہارتیں، علم اور اعتماد حاصل کرتی ہیں۔ مزید برآں، خواتین کی تعلیم میں سرمایہ کاری سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن میں معاشی پیداواری صلاحیت میں اضافہ سے لے کر سماجی ہم آہنگی اور فلاح و بہبود تک شامل ہیں۔ جب تعلیم یافتہ خواتین قیادت اور اثر انداز ہوتی ہیں، تو وہ رول ماڈل اور تبدیلی کے ایجنٹ بنتی ہیں اور مستقبل کی نسلوں کو ان کے خوابوں کو پورا کرنے اور اعلی کامیابی کی طرف ہمت بڑھانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ آخر کار، تعلیم کے تحفظی قوت کو بروقت استعمال کر کے، ہم ایک روشن، زیادہ خوشحال، اور پائیدار مستقبل کی بنیاد رکھتے ہیں جہاں ہر انسان کو موفق ہونے اور انسانیت کے مجموعی ترقی کا حصہ بننے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

حوالہ:

کشواہا، وی ایس، اور سنگھ، ایس (2017)۔ خواتین کے حقوق الفاظ کی تبدیلی اور بااختیار بنانے کے لیے ایک اتپریرک کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ایجوکیشنل کوسٹ- ایجوکیشن اینڈ اپلائیڈ سوشل سائنسز کا ایک بین الاقوامی جریدہ، 8(1)، ص 121-128۔

سعیدہ، ایم (2023)۔ عالمی کیٹالسٹس: ترقی پذیر ممالک میں سماجی تبدیلی کے لیے یونیورسٹیوں کو بااختیار بنانا۔ ایجوکاسیانا: جرنل انواسی پینڈیڈیکن، 2(4)،ص 341-318۔

گھوش، آر، چکرورتی، پی، اور مانسی، کے (2015)۔ خواتین کو بااختیار بنانا اور تعلیم: ہندوستان میں پنچایتیں اور خواتین کے سیلف ہیلپ گروپس۔ تعلیم میں پالیسی فیوچرز، 13 (3)،ص 294-314۔

کنڈو، اے، اور بھٹاچاریہ، اے (2017)۔ خواتین کی تعلیم، امپاورمنٹ اور ایمپلائمنٹ مارکیٹ میں شفٹ۔

جلیمو، ٹی، اور کلبی، پی۔ (2006)۔ خواتین کو بااختیار بنانا: ہندوستان میں سیلف ہیلپ گروپس کے بلیو پرنٹ کی تنقید۔ انڈین جرنل آف جینڈر اسٹڈیز، 13(3)، ص 375-400۔

راجو، ایس (2005)۔ صنف اور بااختیار بنانا: "اب تک اور مزید نہیں" معاون ڈھانچے کی تشکیل۔ بھارت کا ایک کیس۔ نسائی جغرافیہ کا ساتھی، ص 194-207۔

□□□

Dr. Shabbir Ahmed

Assistant Professor(Education)

Maulana Azad National Urdu University

College of Teacher Education

Bhopal-462036 (M.P)

Email ID: ibnesami@gmail.com

Mobile No: 8700705266

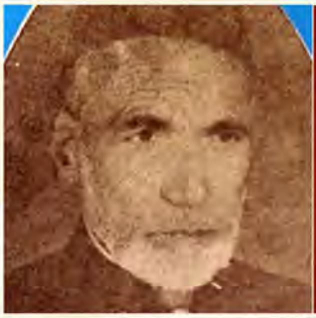

تسنیم قمر

آزادی کے بعد گورکھپور کا ادبی ماحول

تعارف: اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں شہر گورکھپور کو ایک اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے اس لیے کہ گورکھپور زمانہء قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں ہر دور میں ارباب علما وفضلا رہے ہیں جن میں ہر ملت و مذہب، مسلک وطبقہ کے اہل علم و دانشوران حضرات شامل ہیں۔ ادب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ وہ ذرخیز خطہ ہے جہاں کثیر تعداد میں تاریخ ساز اور قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں جنھوں نے اپنی فکر و بصیرت سے علم وادب کو نہ صرف متاثر بلکہ اردو شعر وادب کی روایت میں اضافے بھی کیے ہیں جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، پروفیسر احمر لاری، ڈاکٹر فیروز احمد اور مسلم انصاری کی تحقیقی تخلیقات کی روشنی میں یہ فہرست المعروف بہ مولوی عبدالرحیم بہ تخلص تمنا گورکھپوری سے شروع ہوتی ہے اور آج کے مبتدی شعرا تک پہنچتی ہے۔

شہر گورکھپور ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس شہر کی ادبی فضا نے ہمیشہ ہی شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس لیے یہاں شاعروں اور ادیبوں کی بھی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے جو ملازمت یا تجارت کے سلسلے میں یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، گورکھپور کو اپنا وطن ثانی بنا لیا جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ گورکھپور کے شعرا و ادبا کی فہرست بہت طویل ہے سب کے بارے میں لکھنا تو دور کی بات ہے سب کا شمار کرنا بھی دشوار ہے۔ لیکن گورکھپور کو شاعرانہ مزاج عطا کرنے میں اور ادبی فضا میں نکھار پیدا کرنے والے فنکاروں میں تمنا گورکھپوری، سید احمد علی شاہ، ریاض خیرآبادی، مہدی آفادی، محمد علی اثیم، میر بہادر وحشت، وسیم خیرآبادی، مرزا فہیم گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، محمد علی ولایت ہری ہردت خوشتر، مولوی سبحان اللہ عظیم، سیدن شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری، عجیب گورکھپوری، صغیر گورکھپوری، فراق گورکھپوری، عبدالقیوم رسا فاروقبانس پاری، رنگ بہادر لال جگر، مسعود حسن خاں احمر گورکھپوری، ایشوری پرشاد گہر، وحیداللہ انصاری ہندی گورکھپوری، مسلم انصاری، اور ایم کوٹھیاوی راہی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ زمانۂ قدیم سے ہی زندگی کے ہر گوشہ میں ادب کی اہمیت وافادیت رہی ہے حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔ جناب کوثر ندوی اپنی کتاب ''شمع ادب'' میں بسلسلہ تاریخ اردو شاعری تحریر فرماتے ہیں:

> ''گردش زمانہ سے جب لکھنؤ اور دلی اجڑ گئے تو شعر وادب مختلف مراکز میں منتقل ہو گئے۔ جس میں رام پور اور حیدرآباد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے مشہور شعراء میں

داغ، امیر مینائی، تسلیم اور ریاض قابل ذکر ہیں۔“

جناب ندوی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری 1857 کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ ملک کی دوسری ریاستوں یعنی رام پور اور حیدر آباد میں منتقل ہوئی پھر دوسرے علاقائی شہروں (بشمول گورکھپور) میں پہنچی خواہ بدیر یا بجلد حالانکہ گورکھپور کے شعراء کے سوانحی خاکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت حال اس کے قطعی برعکس ہے۔ یہاں سلاطین اودھ کے آخری عہد 1857 سے قبل ہی اردو شاعری کا رواج قائم ہو چکا تھا۔ سلاطین اودھ کی حکومت کے بعد تو اس شہر کو دبستان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

آزادی کے بعد گورکھپور کا ادبی ماحول: آزادی کے بعد پورے ملک کی فضا تبدیل ہو گئی جس کا اثر ادب پر بھی پڑا۔ وہ شعراء جو آزادی سے قبل انقلابی شاعری کر رہے تھے انھوں نے اپنا لہجہ تبدیل کر لیا کیونکہ آزادی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کی تھی۔ چنانچہ شعراء نے اس جانب توجہ دی اور آپسی بھائی چارگی کو فروغ دینے کی ممکن کوششیں کیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

چلو اک نیا آشیانہ بنائیں
زمانے سے آگے زمانہ بنائیں
نئے ماہ و انجم بچھائیں فلک پر
فلک کو مقام نشانہ بنائیں

(وحید اللہ انصاری ہندی گورکھپوری)

آؤ پرو دیں مل جل کر پھر ان کو پیار کے دھاگے میں
ہے تسبیح تو اب بھی لیکن بکھرا بکھرا دانہ ہے

(مسلم انصاری)

زمانۂ جدید میں گورکھپور کا ادبی ماحول: گورکھپور زمانۂ قدیم سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔ یہاں ہر دور میں علماء و فضلاء کی کثیر تعداد رہی ہے، جن میں ہر مذہب وملت، مسلک وطبقہ کے اہل علم و دانشوران حضرات شامل ہیں۔ جن کی وجہ سے یہاں ہر دور میں علمی سرگرمیاں شباب پر رہی ہیں۔ ادب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ وہ ذرخیز خطہ ہے جہاں کثیر تعداد میں تاریخ ساز اور قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں جنھوں نے اپنی فکر و بصیرت سے علم و ادب کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ شعر و ادب کی روایت میں اضافے بھی کیے ہیں۔ گورکھپور کے ادبی ماحول کا ادب میں بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ یہاں کے ادبا و شعرا نے اپنی ادبی کاوشوں سے ادب کو بہت ہی متاثر کیا ہے۔ ادب کو اپنی کاوشوں سے متاثر کرنے والے شعرا و ادبا کی فہرست منشی مادھو پرشاد، مولوی عبدالرحیم تمنا گورکھپوری، سید احمد علی شاہ، محمد علی اثیم، اوماں پرشاد، بنواری لال اخگر، گنیش پرشاد پیام، ہری ہر دت سنگھ خوشتر، بھگوتی پرشاد ریحاں وغیرہ شعرا سے ہوتی ہوئی فراق گورکھپوری، اصغر گونڈوی، ایشوری پرشاد گہر، مہدی افادی، احمد صدیق مجنوں گورکھپوری، نور العین احمر لاری، محمد ادریس مکرانی، افغان اللہ خاں، محمد علی وارثی جوہر وغیرہ شعرا و ادبا سے آگے بڑھ کر آج یعنی مستقبل کے ادباء و شعراء تک پہنچتی ہے۔ فراق گورکھپوری کے بارے میں پروفیسر کلیم الدین احمد فرماتے ہیں کہ ”میں فراق کو اردو غزل کا ایک اہم ستون تسلیم کرتا ہوں۔“

مشہور شاعر شبنم گورکھپوری نے 1988 میں انگریزی شاعر جان کیٹس 1795 سے 1821 عیسوی کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ (پھول کانٹوں کی سیج پر) کے نام سے کیا جو اردو اکادمی اتر پردیش، لکھنؤ کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی جسے عوام و خواص میں بے حد پسند کیا گیا۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو سال بعد پی۔ بی۔ شیلی، کیٹس، کولرج اور دیگر مغربی شعراء کی نظموں کا ترجمہ کر کے ”بادۂ مغرب“ کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کو انھوں نے وزیر اعظم برطانیہ کے نام منسوب کیا جس کے لیے ملکہ برطانیہ نے انھیں خط بھی لکھا۔ یہ کتاب آج بھی اتر پردیش کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ منتخب اشعار درجہ ذیل ہیں:

حسین ڈھنگ سے میں زندگی گزاروں گا
جہاں میں کتنے دکھی دل ملیں گے انساں کے
میں ان کے غم کو خوشی کا لباس پہنا کر
سکوں کے ساز پہ گاؤں گا پیار کے نغمے

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ شہر گورکھپور کے ادبا اور شعرا کی فہرست بہت طویل ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، پروفیسر احمر لاری، ڈاکٹر فیروز احمد اور مسلم انصاری کی تحقیقی تخلیقات کی روشنی میں یہ فہرست تمنا گورکھپوری سے شروع ہوتی ہے اور آج کے مبتدی شعرا تک پہنچتی ہے۔ صرف ملک ہی نہیں بیرون ملک میں بھی شہرت پانے والے ناظم مشاعرہ عمر قریشی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ یہ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان کا نام ہے جن کی غزلوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کا خون ان کے احساسات کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ان کی تصنیف 'شہر صدا' ہے جس کا انتساب عمر قریشی نے اپنی والدہ مرحوم کے نام کیا ہے۔ یہاں کے شعرا و ادبا کی تعداد اتنی طویل ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں سبھی حضرات کے اوصاف بیان کر پانا کوزے میں دریا سما لینے جیسا ہے۔ تمنا گورکھپوری سے شروع ہو کر یہ فہرست فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، عمر قریشی، جوہر وارثی، مہدی یافادی، منظور احمد، ٹی۔ این۔ شریواستو وفا گورکھپوری، عبدالحی پیام انصاری، گرگٹ گورکھپوری (جیسا کہ تخلص سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ گرگٹ صاحب نے طنز و مزاح کو اپنی شاعری کا امتیازی وصف بنایا) وغیرہ سے چل کر یہ فہرست زمانہ حال کے مبتدی شعرا و بزرگ غزل گو شاعر جالب نعمانی، راز اعظمی، عاصم گونڈوی وغیرہ تک پہنچتی ہے۔ عاصم گونڈوی کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ابر کرم، جھکی محراب کعبہ کی، مہکے مہکے پھول اور نوشتۂ دیوار قابل ذکر ہیں۔ 'ابر کرم' اور 'جھکی محراب کعبہ کی' نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی مجموعہ کلام ابر کرم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'غرض کہ عاصم گونڈوی نے نعت گوئی میں بہت کامیابی حاصل کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ''ابر کرم'' سے عوام کے دل و دماغ معطر ہوں گے اور اہل نظر کی روح کو تازگی حاصل ہوگی۔'

میری جو بات بھی بگڑی ہے، بگاڑی میں نے
میرا جو کام بنا وہ ہے بنایا تیرا
واسطہ رحمت کونین کا دے کر تجھ سے
طالب رحم ہے پھر عاصم خستہ تیرا

کلیم قیصر صاحب زمانہ حال کی محفل کا ایک درخشندہ ستارہ ہیں ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا اصل نام کلیم الدین مکرانی اور تخلص قیصر ہے۔ بلرام پور، یوپی میں 12 اکتوبر 1958 کو عالم ارواح میں تشریف آوری ہوئی اور نا صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑے۔ غزل میں زندگی کے ہزاروں چہرے کی تصویریں دکھائی پڑتی ہیں ادھر کچھ برسوں سے غزل میں بڑے سلیقے سے ماں کا بھی اک تصور آیا ہے جسے ہمارے بہت سے شعرا نے غزل میں بہت سلیقے سے پیش کیا ہے غزل میں محبوب کے لیے ماں کا تصور آتے ہی ہمارا ذہن مرحوم منور رانا صاحب کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن ماں کے تصور کو پوری نغمگی کے ساتھ غزل میں جس شخص نے پیش کیا ہے انھیں ہم ڈاکٹر کلیم قیصر کہتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'بیر بہوٹی' کے نام سے 2005 میں ہی منظر عام پر آ چکا ہے اور 'فن و شخصیت: ظہور الاسلام جاوید' کو ''کہتی ہے تجھے خلق خدا کیا؟'' کے نام سے مرتب کیا:

ایسی اللہ کی رحمت نہیں دیکھی میں نے
ماں سے اچھی کوئی عورت نہیں دیکھی میں نے

ہم زباں کوئی ملے تو اس سے سرگوشی کروں
ورنہ بہتر ہے کہ خود کو نظر خاموشی کروں
تو نے میری راہ میں کانٹے بچھائے تھے کبھی
آ مرے محسن میں پہلے تیری گل پوشی کروں

(کلیم قیصر)

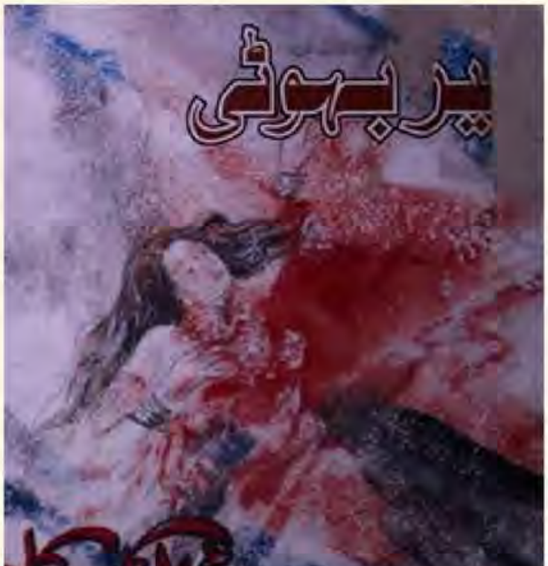

ڈاکٹرعزیز صاحب کے ادبی ذوق کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ان کی کتاب ''یادوں کے انتخاب'' کے لیے یو۔ پی۔ اردو اکادمی نے انعام سے سرفراز کیا۔ ٹی۔ این۔ سریواستو عرف وفا گورکھپوری اور مہیش اشک کو قومی یکجہتی کے لیے، پروفیسر سید فرید احمد اور سلام فیضی صاحب کو برائے فروغ اردو ادب کے لیے، پروفیسر حسن انعام برائے تدریس کے لیے پروفیسر فیروز احمد، پروفیسر قاضی جمال کی کتاب داغ آگہی کے لیے یو۔ پی۔ اردو اکادمی کی جانب سے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ نوجوان شاعر اور ادیب ڈاکٹر اشفاق احمد عمر کو ان کی تصنیف 'غالب سے عہد حاضر تک'، ڈاکٹر انعام الحق اور ہر دل عزیز شاعرہ نصرت عتیق کے ناموں کو بھی اردو اکادمی نے انعام کے لیے منتخب کیا۔ نصرت عتیق صاحبہ دور حاضر کے دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جدوجہد آزادی ان کی کتابوں کا خاص موضوع ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر، ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، تلوک چند محروم کی شاعری اور جدوجہد آزادی، جنگ آزادی شخصیات، نظریات وتحریکات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نصرت عتیق گورکھپوری کا شعر ملاحظہ کریں۔

کچھ تو مظلوم کی آہوں کا اثر بھی ہوگا
زلزلہ یونہی زمیں پر نہیں آیا کرتا

(نصرت عتیق گورکھپوری)

گورکھپور کا ادبی ماحول بہت خوش آئند ہے، فنون ادب کے جملہ اصناف کے تعلق سے جس طرح اس کا ماضی روشن رہا ہے امید ہے؛ بلکہ یقین ہے کہ اس کا مستقبل بے حد تابناک ہوگا۔ اسلاف نے ماضی میں جو نقوش چھوڑے ہیں حال اور مستقبل میں ان کو ہفت رنگ سے سجانے کے لیے نسل نو کی ایک معتوبہ تعداد میدان کار میں پوری تن دہی سے لگی ہوئی ہے۔ تذکرہ وسوانح ہو کہ شعر و ادب، نثر نویسی ہو کہ نظم کی بہار، تحقیقی مقالات ہوں کہ افسانے وڈرامے غرض ہر اصناف میں افراد کار مصروف عمل ہیں۔

ماضی میں گورکھپور اپنے شاعروں اور ادیبوں کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں شہر بے چراغ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے تقریباً سبھی قدآور شعراء آج اس حد تک پس پردہ ہیں کہ ان کی پرچھائیاں بھی کسی کو نظر نہیں آتی۔ نگاہ جستجو گمراہی کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی (تاریخ ادبیات گورکھپور)، مسلم انصاری (دبستان گورکھپور)، ڈاکٹر فیروز احمد (مہدی افادی) کی کوششیں مشعل راہ تو ثابت ہوئیں لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان کتابوں پر بھی گمنامی کی گرد پڑ گئی ہے۔

اس مضمون کا مقصد ان تمام مقامی شعراء و ادباء کو عوام الناس کے روبرو لانا ہے جو آغاز اردو ادب سے تاہنوز اردو زبان کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ تاکہ موجودہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے زریں کارناموں سے باخبر ہو سکیں اور ان پر بجا طور پر فخر کر سکیں۔

ماخذ:

1۔ دبستان گورکھپور، مسلم انصاری
2۔ تاریخ ادبیات گورکھپور، سلام سندیلوی

Tasneem Qamar
Mohalla Peerapura
Behind Do Manzila Masjid
Thana Tiwaripur
PO Bade Qazipur
Distt. Gorakhpur-273001 (U.P)

مریم مختار

عشرت ظفر
’شرارِ سنگ‘ کے آئینے میں

’’شرارِ سنگ‘‘ کے مصنف اور معروف شاعر و نثر نگار عشرت ظفر 14/ اپریل 1944 کو بارہ بنکی کے ایک گاؤں ترکانی میں پیدا ہوئے تھے۔ 18 سال کی عمر میں 1962 میں ترکانی کو خیر آباد کہا اور کانپور کو اپنا وطن ثانی بنایا اور وہاں صحافت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ ایک طویل عرصے تک انھوں نے روزنامہ ’’انوارِ قوم‘‘ کی خدمات انجام دیں۔ شاعری میں غزل عشرت ظفر کی محبوب صنف رہی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے ’’نوشتہ‘‘، ’’ہفت پرکار‘‘، ’’امشب‘‘، ’’سفال‘‘ اور ’’پیچاک‘‘ شائع ہو چکے ہیں۔ نثر میں تنقید اور ناول کے میدان میں طبع آزمائی کی اور بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ تنقیدی مضامین پر مشتمل ’’حرف باریاب‘‘، ’’احتساب‘‘، ’’خدو خال‘‘، ’’استفہام‘‘، ’’نقش امروز‘‘، ’’نمود غبار‘‘ اور ’’آفرینش‘‘ وغیرہ بیش قیمت کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں ’’آخری درویش‘‘ اور ’’شہر سوختہ‘‘ جیسے ناول لکھ کر اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا۔

زیرِ نظر کتاب ’’شرارِ سنگ‘‘ عشرت ظفر کی خودنوشت سوانح ہے جسے انھوں نے ’’از کفِ خاکسترم‘‘ کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن بعد میں ’’شرارِ سنگ‘‘ نام تجویز کیا اور ’’کرۂ ارض پر ہبوط آدم کی ساعت اول کے نام‘‘ انتساب کیا۔ اس کی اشاعت اول 2020 میں نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام عمل میں آئی۔ ’’شرارِ سنگ‘‘ کی ابتدا اگرچہ خود نوشت کی عام ڈگر سے قدرے ہٹ کر ہوئی ہے لیکن ابتدائی صفحات دیگر خودنوشتوں کی طرح ایامِ طفلی کی یادوں سے مزین ہیں۔ سنہ ولادت و جائے ولادت سے لے کر لکھنؤ اور کانپور کی منتقلی، ماں کی وفات کے بعد والد کے عقد ثانی، سوتیلے بھائی کی ولادت، سوتیلی ماں کی وفات اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ گھریلو حالات اور اس وقت کے سیاسی و سماجی و ادبی ماحول سے واقفیت بہم پہنچانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

ترکانی کے ذکر سے جہاں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کی پہلی سانس لی، ان کی وطن پرستی کے جذبات کا کھل کر اظہار ہوتا ہے حالانکہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ کانپور میں گزرا ہے لیکن وطن کی مٹی کی خوشبو نے ان کے وجود کو آخری سانس تک معطر رکھا۔ لکھتے ہیں:

> ’’بجلی کی روشنی اور پختہ اینٹوں کے مکانوں سے محروم اس گاؤں کے تمام گلیارے گرد و غبار سے اٹے رہتے تھے یہ گرد موسم برشگال میں کیچڑ کا روپ اختیار کر لیتی تھی...... آسمان سے بھی الغاروں پانی برستا تھا، راہیں مسدود ہو جاتی تھیں، رسل و رسائل بند، آمد و رفت معطل، اشیائے ضروریہ معدوم و غائب، ہر سال یہی ہوتا تھا اور مہینوں یہی عالم رہتا تھا۔‘‘

(شرارِ سنگ، عشرت ظفر، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، 2020، ص:32)

یہ اقتباس گاؤں کی شکستہ و خستہ حالی کا مکمل پتہ دیتا ہے۔ اتنی پریشانیوں اور مشکلوں کے ہوتے ہوئے ان کی محبت میں کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اپنے گاؤں سے دور ہو کر وطن دوستی کا جذبہ مزید شدت اختیار کر گیا۔ وہ ترکانی میں نہیں رہتے تھے لیکن ترکانی ان کے دل میں بستا تھا۔ شاید ایسے ہی کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر فراق گورکھپوری نے کہا ہوگا کہ ''وہ کوچہ روکش جنت ہو گھر ہے گھر پھر بھی''۔

عشرت ظفر کے بیان کردہ بچپن کے حالات وواقعات سے ان کی معاشی ناآسودگی اور علمی فقدان کا پتہ چلتا ہے لیکن چونکہ ان کی طبیعت بچپن سے ہی حصولِ علم کی طرف راغب تھی چنانچہ انھوں نے اس تاریک ماحول میں اپنے علم کی شمع کو جلائے رکھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی روشنی کو مزید تقویت بخشتے چلے گئے۔ ایک ایسے ماحول میں جو ان کی طبیعت سے مختلف تھا ظفر احمد سے عشرت ظفر بننا نہایت مشکل تھا لیکن ہر مشکل پر ان کا شوقِ بے پناہ غالب تھا اس شوقِ بے پناہ اور اس کی مغلوبیت نے ان کا یہ سفر آسان بنا دیا اور آج پوری دنیائے اردو ادب عشرت ظفر کے نام سے واقف ہے۔

اس زمانے میں مسلم طبقے میں تعلیم کا رواج عام تھا نہ کسی کے دل میں حصولِ تعلیم کا شوق تھا اور پھر عشرت ظفر کا گھرانہ بھی خالص مشرقی و مذہبی تھا جہاں کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی ممانعت نہیں تھی چنانچہ حصولِ تعلیم کے شوقِ بے پناہ نے عشرت ظفر کو اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی و ہندی جیسی زبانوں کا عالم بنا دیا۔

''شرارِ سنگ'' میں بار بار عشرت ظفر کی طمع دنیا سے بے رغبتی کا اظہار اور علم وفن سے شدید محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ بقول عشرت ظفر:

> ''میں کم وبیش تیس کتابوں کا مرتب ومصنف ہوں اور یہی میرا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔''

(شرارِ سنگ، عشرت ظفر، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، 2020، ص:32)

عشرت ظفر نے باقاعدہ کسی بھی درسگاہ سے تعلیم حاصل نہیں کی نہ کبھی ان کے پاس کوئی تعلیمی سند رہی محض ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر اتنی کتابوں کی تصنیف وتالیف درجہ بالا قول کا گہرا ثبوت ہے۔

عشرت ظفر کی تعلیمی رکاوٹ کے اسباب میں سوتیلی ماں اور سوتیلے نانیہال کی ستم ظریفیاں بھی شامل ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں تعلیم نہ دلائی جائے بلکہ کسی کام پر لگا یا جائے ان کی اس تجویز پر ان کے والد نے سرِ تسلیم خم کیا کیونکہ وہ اپنے دونوں بچوں ظفر احمد اور محمد عارف سمیت اپنی نئی سسرال کے رحم وکرم پر تھے ان کے اندر انکار اور رد کی ہمت نہیں تھی۔ عشرت ظفر اپنے والد کے قوت فیصلہ کی کمی کی بھینٹ چڑھ گئے کیونکہ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ایک سادہ لوح انسان تھے جس کا دل بزرگوں کے جذبہ احترام سے لبریز تھا۔ چنانچہ گھڑی سازی کا ہنر سکھانے کے لیے ان کو بوگھڑی ساز کے سپرد کر دیا گیا۔ گھڑی کی مرمت سے ان کے مزاج کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا زیادہ دن وہاں رہ نہیں سکے اور آدھے ادھورے ہنر کے ساتھ فرار حاصل کر لیا۔

''شرارِ سنگ'' کے مطالعہ سے عشرت ظفر کی ازدواجی زندگی کی تلخیوں اور ناخوشگواریت کا پتہ چلتا ہے کئی مقام پر انھوں نے اپنے اس دکھ کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کو ایک باشعور، سادہ لوح اور وفادار شریک سفر مطلوب تھی لیکن ان کی یہ طلب طلب ہی رہی ان کے والد صاحب نے ایک ان پڑھ اور بے شعور خاتون سے ان کی شادی کر دی۔ نتیجہ کے طور پر ازدواجی زندگی کی تلخیاں اور ناکامیاں ان کا مقدر بن گئیں لیکن انھوں نے اعلیٰ ظرفی اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بحسن وخوبی شاہ جہاں بیگم کا ساتھ نبھایا اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آنے دیا۔ شاہ جہاں بیگم سے عشرت ظفر کی پانچ اولادیں ہوئیں، تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔ پہلی بیٹی بشریٰ ظفر چھ (6) سال کی عمر میں وفات پا گئی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی کے حوالہ

سے عشرت ظفر اس طرح رقم طراز ہیں:

''میری شادی ایک بے شعور شاہ جہاں بیگم نامی خاتون سے 1969 میں کردی گئی میں نے اپنے والد کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور خود کو ایک جہنم زار کے حوالے کر دیا میں باضابطہ طریقے سے نہ علم حاصل کر سکا نہ ہنر اور نہ بہتر ازدواجی زندگی ہی میرا مقدر بن سکی مگر میں نے بحسن وخوبی سب کچھ نبھا دیا ساری عمر ایک جہنم میں جلا ہوں، ہوسکتا ہے کہ میرے لیے دوزخ کی آگ پانی کردی جائے''۔

(شرارِ سنگ، عشرت ظفر، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی،2020،ص:49)

''شرارِ سنگ'' میں عشرت ظفر نے اپنی والدہ کا باقاعدہ کوئی خاکہ پیش نہیں کیا ہے لیکن گاہے گاہے کے ذکر سے ان کے مزاج وطبیعت اور سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک بامروت، سادہ لوح، بردبار اور وضع دار خاتون تھیں، نیک دل بیوی اور مشفق ماں تھیں، وہ ایرانی النسل تھیں ان کی مادری زبان فارسی تھی اردو سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔ وہ بچپن سے ہی عشرت ظفر کو فارسی اشعار اور فقرے سناتیں اور سکھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ بقول عشرت ظفر میں آغوش مادر میں ہی ''کریما بہ بخشائے بر حال ما'' اور ''جگر گوشہ من اشک مریز'' وغیرہ سیکھ لیا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عشرت ظفر کی مادری زبان فارسی تھی اور اردو زبان انھیں اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی۔

عشرت ظفر ایک اچھے ناول نگار بھی ہیں اور ناول میں منظر کشی کی اہمیت مسلم ہے۔ انھیں منظر نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے انھوں نے گاؤں کا نقشہ ایسی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس دور کا پورا ماحول ہمارے پیش نظر ہو جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہم خود وہاں جا پہنچے ہیں۔ گاؤں کے حالات کے ساتھ ساتھ وہاں کے مکینوں کی سادہ مزاجی اور قناعت پسندی سے واقفیت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کے حرص وحسد جیسے جذبہ سے بے نیاز دلوں میں مال وزر کی خواہش تھی نہ محرومی وکم مائیگی کا کوئی ملال تھا بلکہ مگن اور مطمئن سب اپنی اپنی زندگی میں شاد تھے۔ عشرت ظفر بھی اسی ماحول کا حصہ ہیں بچپن سے اپنے گرد وپیش انھوں نے یہی دنیا دیکھی تھی چنانچہ ان کے مزاج میں بھی قناعت پسندی در آئی۔ انھوں نے بے انتہا حصول علم اور سادہ لوح وباوفا شریک حیات کے علاوہ کبھی کوئی ایسا خواب دیکھنے کی جرأت نہیں کی جس کی تعبیر کا امکان نہ ہو۔ اچھی کتابوں اور خوبصورت عورتوں کے علاوہ ان کے قناعت پسند دل میں دوسری کسی چیز کی خواہش وطلب کم تھی۔

کتاب اور عورت یہ دو ایسی چیزیں ہیں جن کا شمار عشرت ظفر کی کمزوریوں میں ہوتا ہے اس میں بھی انھوں نے کتاب کو فوقیت دی ہے کیونکہ مطالعہ کی لذت سے عہد طفلی سے ہی سیراب ہوتے آئے ہیں اور انھیں مطالعوں خاص کر شاعری کے مطالعہ کے ذریعہ عورت اپنے پورے وقار اور نسوانی حسن کے ساتھ ان کے اندر داخل ہوئی ہے۔ اگر شاعری نے ان پر عورت کے رموز واسرار منکشف نہ کیے ہوتے تو ان کی زندگی میں عورت کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی بلکہ ان کے نزدیک عورت کا وجود محض ایک ضرورت کے طور پر ہوتا۔ لکھتے ہیں:

''میں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کروں گا کہ میں عمر کے کسی بھی حصے میں اپنے شوق بے انتہا کو زندگی کے کسی بھی منظر سے منہا نہیں کر سکا مشاہدے اور مطالعے نے ہی میرے مزاج و منہاج کو متعین کیا ہے اور اس سے جو لذت وسرشاری مجھے ملتی رہی ہے اور جو سرور جاودانی میری رگ وپے میں دوڑتا ہے وہ کبھی کسی بھی محبوبہ مہربان کے وصل سے نصیب نہیں ہوا یہ کائنات میرے لیے ایک شاہد رعنا ہے اس سے لطف ولذت صرف خلوت میں ہی حاصل کیا جاسکتا ہے میں اس کتاب کا مطالعہ تنہائی میں کرتا ہوں اور ایک محو نوازش محبوبہ کے وصل حیات آفریں سے کہیں زیادہ لذتیں سمیٹتا ہوں میں اس لذت جاوید سے بہت کم سنی میں ہی آشنا ہو گیا تھا اور اس تعارف اول کی سرشاری آج بھی باقی ہے اب جبکہ میرے سر پر برف جم چکی ہے اور چراغ عمر کی لو تھرتھرا رہی ہے میں آج بھی اس لذت بے نہایت کے حصار میں ہوں اس سرشاری میں ایک تواتر ہے ایک تسلسل ہے اور ہیشگی بھی، جبکہ خوبصورت حسیناؤں کے گداز جسموں سے جو لذتیں مجھے ملی تھیں وہ پل دو پل سے زیادہ کی نہیں تھیں اور کچھ دیر بعد کافور ہو جاتی تھیں اور میں خود کو تشنگی کے صحرا میں بھٹکتا ہوا پاتا تھا میں جس لذت دوام کا جویا اور متمنی رہا ہوں وہ مجھے صرف کتاب سے ہی حاصل ہوسکی ہے اور اس کے نافے سے نکلنے والی خوشبو ہی میرے لیے تسکین جاودانی فراہم کرتی ہے۔''

(شرارِ سنگ، عشرت ظفر، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، 2020،ص:88)

حالانکہ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی زندگی میں شاعری یا عورت کا پہلا یا دوسرا درجہ نہیں ہے، دونوں ہی ان کی فطرت میں روز اول سے شامل

ہیں لیکن اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں شاعری کو پہلا اور عورت کو دوسرا درجہ حاصل ہے کیونکہ ان کی زندگی میں عورت کی داخلیت شاعری کی مرہون منت ہے۔

حالانکہ لکھنؤ میں عشرت ظفر کا قیام مختصر تھا لیکن وہ بھی ان کے آبائی گاؤں ترکانی کی طرح ان کے دل میں رچا بسا ہے۔ اپنے شعری سفر کا آغاز بھی انھوں نے لکھنؤ سے ہی کیا تھا اور جو ادیب و شاعر لکھنؤ میں تھے آخر وقت تک ان سے ان کے مراسم برقرار تھے جیسے شاہ نواز قریشی، فیاض رفعت، مخمور کاکوروی، احسن قدوائی، رباب رشیدی وغیرہ۔ جن دوستوں اور رفیقوں سے زندگی نے وفا نہ کی ان کی یادوں سے ان کا دل منور ہے ان میں عرفان صدیقی، نیر مسعود، والی آسی، شوکت عمر حسن، واصف عثمانی وغیرہ شامل ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے کئی تصانیف پر ان کو ایوارڈ ملے ہیں۔ میر اکادمی نے ان کے ناول ''آخری درویش'' پر ایوارڈ سے نوازا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ کا تہذیبی عروج نہیں دیکھا ان کے سامنے زوال پذیر لکھنؤ تھا دلچسپ بات یہ ہے کہ ستّر (70) سال کی عمر میں گہرے مطالعہ اور غیر معمولی حافظہ کی مدد سے لکھنؤ کی تہذیب کے عروج و زوال کا ایسا منظر اُبھارا ہے جیسا کہ وہ اپنے دور میں موجود تھا۔

عشرت ظفر کو فطرت سے بے حد لگاؤ ہے۔ جابہ جا انھوں نے پانی، مٹی، پہاڑ، چاند، سورج، ستارے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ آگ اور ہوا سے بھی انھیں حد درجہ پیار رہا ہے۔ غیر معمولی یادداشت کے مالک عشرت ظفر تنہائی پسند انسان تھے۔ وہ ایک ایسے شخص تھے جس کے یہاں نشاط کا عنصر کم اور حزن و ملال کی کثرت ہے جس سے ان کی حساسیت کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ خوش رہنے کے لیے خوشی کی نہیں بے حسی کی ضرورت ہوتی ہے۔

عشرت ظفر نے ''شرارِ سنگ'' کے چھ صفحات بیسویں صدی کے ممتاز و منفرد عرب شاعر نزار توفیق قبانی جسے شاعرِ زن کہا جاتا ہے، کی نذر کیے ہیں اور مختصراً اس کی اور اس کی شاعری کا بیان کیا ہے۔ عشرت ظفر کے یہاں نزار قبانی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ''شرارِ سنگ'' کی ابتدا ان کی خودنوشت کے اردو ترجمہ ''شاعری کی راہ میں'' (مترجم ابو عمیش) کے اقتباس سے کی ہے۔

عشرت ظفر نے اپنے اس سوانحی رزمیہ میں شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی اپنے قارئین کو متعارف کرایا ہے اور ان کا ذکر خاص بہت عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ جہاں فاروقی کا نام آئے گا وہاں جدیدیت کے رجحان سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ عشرت ظفر صاحب نے بھی فاروقی کے ساتھ جدیدیت کا ذکر کیا ہے اور جدید شاعر کے حوالے سے غالبؔ اور اقبالؔ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فاروقی صاحب کے رسالہ ''شب خون'' میں عشرت ظفر کی غزلیں 1972 میں سب سے پہلے شائع ہوئی تھیں اور آخر تک ان کا کلام ''شب خون'' میں چھپتا رہا جس کے لیے وہ اپنی تحریروں میں فاروقی صاحب کے بہت مشکور و ممنون نظر آتے ہیں۔ اپنے رسالہ میں ان کی غزلیں شائع کرنے کے علاوہ انھوں نے ان کے ناول ''آخری درویش'' پر تبصرہ اور شعری مجموعہ ''سفال'' پر دیباچہ تحریر کر کے ان کو اپنے احسان سے مزید گراں بار کر دیا۔ عشرت ظفر فاروقی صاحب سے مستفید و متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فاروقی صاحب کے مختصر سے بیان میں ان کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔

''شرارِ سنگ'' میں واقعات کی بے ترتیبی کا پورا پورا احساس ہوتا ہے لیکن واقعات کی دلچسپی اور سحر انگیزی احساس بے ترتیبی کو طبیعت پر اثر انداز نہیں ہونے دیتی۔ دلچسپ اور معلوماتی واقعات قاری کے ذہن و دل پر سحر کی ایسی کیفیت طاری کرتے ہیں کہ وہ عشرت ظفر کی تحریروں میں ڈوب کر اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے نیاز و بے خبر ہو جاتا ہے۔

اس سوانحی رزمیہ میں واقعات کی تکرار سے ہلکی سی کوفت اور ناگواری کی فضا دل و دماغ پر چھا جاتی ہے لیکن یہ فضا دیرپا نہیں ہوتی اور جلد ہی اس فضا سے ذہن کا مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ حصول علم کا شوق بے پناہ اور جامعاتی سند سے محرومی کا احساس تکرار واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جس سے عشرت ظفر کے ذوق و شوق اور علم و ادب سے وابستگی کا شدید احساس ہوتا ہے اور افسوس بھی کہ علم و ادب کے اس بے حد قدر دان شخص کی وہ قدر نہیں ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا۔

یہ سوانحی رزمیہ نہ صرف عشرت ظفر کے سوانحی حالات و واقعات سے واقف کراتا ہے بلکہ اس کے مطالعہ سے پوری عالمی تاریخ، اخلاق اقدار، سیاسی و معاشرتی انتشار وغیرہ سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ رزمیہ ہمیں ادبی دنیا کی بھی سیر کراتا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی اور مغربی ادب پر بھی انھیں پورا عبور حاصل ہے اور یہ ایک قابل رشک پہلو ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا کسی اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں رہا اس کا سینہ پوری دنیا کے علوم سے منور ہے۔

عشرت ظفر نے صرف ہندوستان کو ہی اپنا موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ تقسیم ملک، قیام پاکستان اور کربِ ہجرت کے ساتھ ساتھ امریکہ، ایران، ترکی، مصر، فلسطین، اسرائیل، روس، شام اور سعودی عرب وغیرہ ممالک کی تاریخ، جنگیں، سیاسی انتشار، تغیر و انقلاب، تہذیب و تمدن کے زوال کا ذکر جابہ جا کیا ہے جس سے ان کے وسیع و عمیق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح

یہ سوانح صرف عشرت ظفر کی سوانح نہ ہو کر پوری دنیا کا رزمیہ بن جاتی ہے۔

یہ کتاب علم الاصنام اور فنون لطیفہ سے بھی عشرت ظفر کی گہری وابستگی کا پتہ دیتی ہے۔ ہندوستان کی ہی نہیں پوری دنیا کی دیو مالا ان کے مطالعہ میں رہی ہے لیکن بقول ان کے ''یونانی صنمیات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا''۔ اس بات کی تصدیق پرومی تھیس، عشتار، افرودیتی اور برطانوی شاعر لارڈ بائرن جس کے یہاں یونانی صنمیات کا حسن سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، کے بیان سے ہو جاتی ہے۔

عشرت ظفر نے اپنی کمیوں اور کمزوریوں کا کھل کر اظہار کیا ہے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے وہ اپنی عملی زندگی میں جیسے تھے ویسا ہی اپنے قارئین کے سامنے ''شرارِ سنگ'' کی صورت میں خود کو پیش کیا ہے۔ تکبر سے پاک لہجہ ان کی سچائی اور عاجزی و انکساری کا پتہ دیتا ہے۔ اس طرح یہ خودنوشت سچائی، صداقت، دیانتداری اور حقیقت نگاری کے اصول پر تو پوری اترتی ہے لیکن دیگر اصولوں سے انحراف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خودنوشت سوانح کا محور و مرکز خودنوشت نگار کی ذات ہوتی ہے حالانکہ خارجی موضوعات کا بھی بیان ہوتا ہے لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ ''شرارِ سنگ'' میں مصنف نے اپنے بارے میں اتنے کم بیان پیش کیے ہیں کہ ان پر ثانوی کردار ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

زبان و بیان کی سادگی خودنوشت کا اہم اصول ہے لیکن مصنف نے اس اصول کی نفی کرتے ہوئے مشکل اور دقیق الفاظ کا استعما کیا ہے جس پر فارسیت کا غلبہ ہے۔ یوں تو زبان و بیان کے لحاظ سے ''شرارِ سنگ'' ایک عمدہ کتاب ہے جس کے لیے مصنف مبارکباد کا مستحق ہے لیکن خود نوشت سوانح کے لحاظ سے زبان و بیان کی یہ پیچیدگی مناسب معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ایک عام قاری کے لیے سوائے مشکل اور ذہنی الجھنوں کے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوسکتا۔ بے جا طویل تر جملوں کا استعمال بھی ذہن کو کھٹکتا ہے۔ خودنوشت کو دلچسپ بنانے کے لیے مصنف نے اشعار کا سہارا لیا ہے لیکن بیشتر اشعار فارسی میں ہیں جو عام قاری کو دلچسپی فراہم کرنے کے بجائے اس کی الجھن اور تناؤ کا سبب بنتے ہیں جو کہ خودنوشت کی ایک بہت بڑی کمی ہے کہ وہ اپنے قاری کو مطمئن کرنے کے بجائے اسے ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دے۔ بہر حال ''شرارِ سنگ'' میں واقعات کی بے ربطی اور تکرار کے ساتھ ساتھ دوسری بہت سی کمیوں اور خامیوں کو محسوس کرنے کے باوجود بھی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ مصنف نے خود ہی اعتراف کر لیا ہے کہ:

''میرے یہاں موضوعات کا ارتکاز بھی ہے پھیلاؤ بھی مقامات کے اشارے بھی ہیں اور خاطر خواہ تفصیل بھی لیکن میرا اپنا بہت کم ہے۔ یہ میرے فکری شعور کا سیل بے نہایت ہے اس میں کوئی تسلسل نہیں ہے یہ تکنیک آسان اور قابل فہم ہے،............ میں خودنوشت کے اسالیب میں نہیں فکشن کے اسالیب میں ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے بات کر رہا ہوں کہیں کہیں کچھ کردار بھی ہیں زمانوں کے اعتبار سے لیکن ناموں کی کھتونی نہیں ہے جو روایتی خودنوشت کا ناگزیر حصہ ہوتی ہے بس باتیں ہیں جو کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہیں اور کہیں بھی ختم ہو سکتی ہیں''۔

(شرارِ سنگ، عشرت ظفر، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی 2020، ص:86)

لہٰذا یہ خودنوشت سوانح نگاری خودنوشت سوانح کے فنی تقاضوں پر پورا نہ اترنے کے باوجود اپنی بہت سی خوبیوں اور قابل اعتراض عیوب کے ساتھ بہ سرو چشم قبول ہے۔

Mariyam Mukhtar
Room No: 176
Begum Azeezun Nisa Hall
Medical Colony
AMU, Aligarh-202001 (U.P)
Mob: 7007515909
psnaaz1992@gmail.com

فرزانہ اسد

اردو شاعری میں دیوالی

ہمارا ملک، بھارت کئی تہذیبوں کا گہوارا ہے۔مختلف مذاہب کے ماننے والے اور کئی زبانیں بولنے والے لوگ اس سرزمین پر آباد ہیں۔اسی طرح ہمارے تہوار جو الگ الگ مذاہب کے ترجمان ہیں متعلقہ تہذیبوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔لوگ ان تہواروں کو مل جل کر مناتے ہیں اور ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں،یہی ہماری گنگا جمنی تہذیب ہے۔دیوالی ہمارے ملک کے اہم تہواروں میں سے ایک ہے جو ہر سال بڑے جوش وخروش کے ساتھ منائی جاتی ہے۔اس تہوار کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے معروف ادیب اور محقق ڈاکٹر شرف الدین ساحل لکھتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس دن واسودیو (کرشن) کی بیوی لکشمی،راجہ ویروجن کے لڑکے بل کو جو ساتویں زمین کے اندر قید ہے آزاد کر کے دنیا میں لاتی ہے۔اسی لیے اس دن کو بلراج بھی کہتے ہیں یعنی طاقت کی حکومت۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ 'بل' کرتیا جگ میں نیکی اور سچائی اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔اسی لئے 'بل' کے دنیا میں آجانے سے دیوالی کا دن 'کریتا جگ' کی طرح ہوجاتا ہے۔اسی دن وکرمادِتیہ اور رام چند جی کا راج تِلک بھی ہوا تھا اس لیے یہ ہندوؤں کے لیے دوہری خوشی کا دن ہے۔''

(ڈاکٹر شرف الدین ساحل،قومی یکجہتی کا منظر نامہ،ناگپور ص168)

اردو زبان اور اس کی شاعری محبت کے جذبات سے معمور ہے۔اس میں اہلِ وطن اور ملک کی محبت کے ساتھ اس سرزمین کے مختلف مظاہر سے بھی والہانہ لگاؤ کا شاعرانہ اظہار ملتا ہے۔یہ اس زبان کی ایک امتیازی خوبی ہے اور یہی اس کی مقبولیت کا ایک اہم سبب بھی ہے۔اردو شاعری کے قومی مزاج کے متعلق مشہور محقق ڈاکٹر آغا غیاث الرحمن لکھتے ہیں۔

''اردو شاعری کا مزاج ابتدا ہی سے ہندوستانی تہذیب، رواداری اور قومی یکجہتی میں ڈوبا ہوا ہے۔عمومیت اور ہندوستانیت اس کا خاص وصف ہے۔اس نے ہمیشہ انسانی دوستی،اخوت،محبت اور ہمدردی کے نغمے گائے ہیں۔اردو شعرانے ہندوستانی تہذیب،عوامی زندگی کے

حالات اور معاملات، رسم و رواج، میلوں اور تہواروں پر نظمیں لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔''

(ڈاکٹر آغا غیاث الرحمن، اوراق، مرتبہ ڈاکٹر جاوید احمد خان 2019، ناگپور، ص134)

اردو شاعری میں فارسی ادب اور شاعری کے اثر سے روشنی اور چراغاں کا استعمال بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ ان چیزوں کو اردو شاعری میں استعاراتی اور علامتی سطح پر بھی بخوبی برتا گیا ہے۔ شمع، پروانہ، دیا، چراغ وغیرہ الفاظ اردو شاعری میں کثرت سے لغوی معنی اور استعاراتی و علامتی معنوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ اردو میں واضح طور پر جن تہواروں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں دیوالی سب سے اہم ہے۔ اس تہوار کو اردو شاعری میں کہیں تو روشنیوں اور خوشیوں کے اظہار کے طور پر دیکھا گیا ہے اور کہیں باطل پر حق کی فتح کی حیثیت سے۔ ہماری بے شمار نظموں میں اور خاص طور پر ادبِ اطفال میں اس تہوار کی بڑی خوبصورت عکاسی موجود ہے۔ کہیں اس تہوار میں جلائے جانے والے دیوں کا تذکرہ ہے اور کہیں اس موقع پر داغے جانے والے پٹاخوں اور پھلجھڑیوں کی خوبصورت تصویر کشی ملتی ہے۔

اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی جو اپنے کلام میں بھارت کے تہواروں کی عکاسی کے لیے مشہور ہیں بھلا دیوالی کا تذکرہ کیے بغیر کیسے رہ سکتے تھے ان کی نظم 'دیوالی کا سامان' میں دیوالی کا منظر ملاحظہ فرمائیں:

ہر اک مکاں میں جلا دیا دیوالی کا
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دیوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دیوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دیوالی کا

اردو شعرا نے دیوالی کے حوالے سے زندگی کے کئی پہلو نمایاں کیے ہیں۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

داغوں کی بس دکھائی دی دوالی میں روشنی
ہم سا نہ ہوگا کوئی جہاں میں دوالیہ

(حاتم علی مہر)

جل بجھوں گا بھڑک کے دم بھر میں
میں ہوں گویا دیا دوالی کا

(نادر شاہ جہاں پوری)

بیس برس سے اک تارے پر من کی جوت جگاتا ہوں
دیوالی کی رات کو تو بھی کوئی دیا جلایا کر

(ماجد الباقری)

ہستی کا نظارہ کیا کہیے مرتا ہے کوئی جیتا ہے کوئی
جیسے کہ دوالی ہو کہ دیا جلتا جائے بجھتا جائے

(نشور واحدی)

تھا انتظار منائیں گے مل کے دیوالی
نہ تم ہی لوٹ کے آئے نہ وقتِ شام ہوا

(آنس معین)

ہونے دو چراغاں محلوں میں کیا ہم کو اگر دیوالی ہے
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم مزدور کی دنیا کالی ہے

(جمیل مظہری)

وہ دن بھی ہائے کیا دن تھے جب اپنا بھی تعلق تھا
دشہرے سے دوالی سے بسنتوں سے بہاروں سے

(کیف بھوپالی)

فراق گورکھپوری کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے کئی حوالے موجود ہیں۔ اس میں دیوالی کا تذکرہ آفاقی تناظر میں پوری تہذیب سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ دیوالی کی شام کو وہ کھیتوں کی شادابی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندو مذہب کے اکثر تہوار ہماری معاشی آسودگی اور زرعی ترقی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

نئی ہوئی پھر رسم پرانی دیوالی کے دیپ جلے
شام سلونی رات سہانی دیوالی کے دیپ جلے
دھرتی کا رس ڈول رہا ہے دور دور تک کھیتوں میں
لہرائے وہ آنچل دھانی دیوالی کے دیپ جلے

اس تہوار کو وہ جہاں پرانی رسموں کی تجدید کے روپ میں دیکھتے ہیں وہیں وہ عصرِ حاضر کی زبوں حالی سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔انھیں دیوالی کے تہوار میں غربت کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس تہوار کی رنگینیاں ایک سوانگ ہے۔

کتنی مہنگی ہیں سب چیزیں کتنے سستے ہیں آنسو
اف یہ گرانی یہ ارزانی دیوالی کے دیپ جلے
آج رات کی بد حالی نے خوش حالی کا سوانگ بھرا
بنی لکشمی دکھ کی رانی دیوالی کے دیپ جلے

اردو کے مشہور شاعر غلام ربانی تاباں دیوالی کے تہوار کی روشنیوں کو شر یعنی باطل پر خیر اور حق کی فتح کے روپ میں دیکھتے ہیں:

ہزار صدیوں کی تاریک و تیرہ راتوں میں
بنی رہی ہے جو انساں کے خواب کا مرکز
وہ صبح دور نہیں
اندھیری رات کے سینے سے نور کا چشمہ
ابلنے والا ہے
یہ ٹمٹماتے ہوئے دئے لکشمی کے چرنوں میں۔

شہر ناگپور کے مشہور شاعر طرفہ قریشی دیوالی اور عید کو اس ملک کی مشترک تہذیب کا مظہر قرار دیتے ہیں۔

آرٹ سے اپنے کیا ہم نے جلوسوں کا سنگھار
پر کشش ہم سے ہوئے سینکڑوں قومی تہوار
عید بھی ہم کو ہے دیوالی کے جیسی مرغوب
ہمیں ہندو سے محبت ہے مسلماں سے پیار

جدید شاعر مخمور سعیدی اس تہوار کے اندر چھپے آفاقی پیغام کو زندگی کا حصہ بنا لینے کی خواہش کرتے ہوئے اسے مثبت انداز میں ان اشعار میں پیش کرتے ہیں۔

مگر یہ رات جو مہماں ہے چند لمحوں کی
اسی ایک رات کو ہم کیوں نہ جاوداں کر لیں
یہ رات لائی ہے ساتھ اپنے جن اجالوں کو
نہ کس لیے اسے محفوظِ قلب و جاں کر لیں

اسی حقیقت کو ودربھ کے معروف شاعر محبوب راہی نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔دیوالی ان کے نزدیک روشنی کا ایک پیغام ہے جو ہمیں مل جل کر ملک کی ترقی کی طرف گامزن ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے:

ہر تاریکی آج مٹاؤ   نور جہاں میں پھیلاؤ
جگ مگ جگ مگ دیپ جلاؤ   دیپ جلاؤ، دیپ جلاؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ
ہندو مسلم سکھ عیسائی   آپس میں ہیں بھائی بھائی
سب کو اپنے گلے لگاؤ   دیپ جلاؤ، دیپ جلاؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ

بچوں کے شاعر حیدر بیابانی نے اپنے مخصوص انداز میں دیوالی کے تہوار میں ہونے والے چراغاں کا منظر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

دیوالی کے دیپ جلے   یار سے ملنے یار چلے
چاروں جانب دھوم دھڑاکا   چھوٹے راکٹ اور پٹاخہ
گھر گھر پھلجھڑیاں چھوٹے   من ہی من میں لڈو پھوٹے
دیپ جلے ہیں گھر آنگن میں   اجیارا ہو جائے من میں

مشہور شاعر ڈاکٹر منشا اس تہوار کو عوامی دلچسپی اور خوشیوں کا ایک موقع اور فتح کی ایک نشانی قرار دیتے ہیں۔

کتنا رنگیں کتنا سندر جلوہ ہے دیوالی کا
جس کو دیکھو جاں و دل سے شیدا ہے دیوالی کا
ہر اک اپنے اپنے طور سے اس کو منانے میں ہے مگن آ
نگن آنگن محفل محفل چرچا ہے دیوالی کا
سچ تو یہ ہے کہ سچائی کی وجے کی ایک نشانی ہے
تہواروں میں تبھی تو اونچا ہے رتبہ دیوالی کا

غرض اردو شاعری میں دیوالی کے ساتھ وابستہ عقیدت اور پاکیزہ جذبات و احساسات کے علاوہ اس تہوار کے مختلف مناظر شعری تلازمات کے ذریعے خوبصورتی اور سلیقے سے پیش کیے ہیں اور اس کے جمالیاتی اور سماجی پہلوؤں کو معنی خیز انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔

□□□

Farzana Asad
30 Gulistan Colony
Jafar Nagar
Nagpur-440013 (M.S)
zarnigar2006@gmail.com

اختر النساء

شیخ جمالی کا تعارف

ہندوستان کی تاریخ میں سلطنت دہلی کا ایک اہم مقام ہے۔اس دور کے حکمران نہ صرف تلوار بازی کے ماہر،عادل وانصاف کے حامی اور تعمیرات کے شوقین تھے، بلکہ علما،فضلا،صوفیا،شعرا وادبا کے بھی بہت قدر دان تھے۔ہندوستان کے عظیم صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء کا تعلق بھی اسی دور سے ہے آپ کے بعد بھی دیگر نامور صوفی ہوئے ہیں ان میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی بھی ہیں جو آپ کے جانشین ہوئے۔اس کے علاوہ،امیر خسرو،حسن سجزی،ضیاء الدین برنی جیسے بڑے بڑے شعرا اور مورخین بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن دہلی میں تغلق عہد کے تیسرا حکمراں جو کہ دیندار،منصف، علما،فضلا کا قدر دان،علوم وفنون کے ترقی کا راستہ ہموار کرنے والا تھا۔اس کے 790ھ میں اس دنیا سے جاتے ہی زوال کے کالے بادل پورے ملک میں چھا گئے،صوبے مختلف ریاستوں میں بٹ گئے،اور اپنی اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں،اور یہ زوال کے کالے بادل ایک لمبے وقت 790 سے 855ھ تک چھائے رہے،اس طویل عرصہ میں نہ تو کوئی قابل ونامور حکمران نمودار ہوا اور نہ ہی ادبی وفنی ترقی ہوئی نہ کوئی مشہور ومعروف عالم وفاضل،صوفی شاعر،مؤرخ پیدا ہوئے جب 855ھ لودی خاندان کی حکمرانی قائم ہوئی جس کا اولین حکمراں بہلول لودی تھا جس نے 855ھ سے 849ھ تک حکومت کی ہے۔یہی ریاستیں دہلی میں قائم ہوئیں جو کئی صوبوں پر تخت نشین ہوئے اور پھر سے علم وادب،شعراء کا سورج طلوع ہوتا نظر آنے لگا،اس دور میں ہندوستان میں چند عالم وادبا روشناس ہوئے، جیسے،مجد الدین بابری،برہمن،شیخ رزق اللہ دہلوی،سید معین الحق،حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سید محمد،سید محمد مکی الدہلوی،قاضی شہاب الدین احمد دولت آبادی،میاں بھوہ،بدر ابراہیم،محمد بن داؤد،شیخ ابراہیم قوام فاروقی، محمود بن ضیاء الدین،جمالی کنبوہی۔

اس خاندان کے آخری حکمراں ابراہیم لودی کو جب 1530 میں مغل بادشاہ بابر کے ہاتھ شکست ہوئی،تو اس دور کے ادبا شعرا،علما وفضلا سب مغل دربار سے منسلک ہو گئے،اور ان کی اس دربار میں بہت ہی قدر ہوئی،اس دربار سے وابستہ ہونے والوں میں ایک مشہور ومعروف شخصیت جمالی کنبوہی تھا۔

جمالی دہلوی اس نازک کھڑی کا ایک چمکتا ہوا ادیب،سیاح،شاعر وصوفی تھا،جو اپنی خوش اخلاقی،خوش مزاجی،برجستگی سے وقت کے مشائخ، صوفیہ،امرا،وسلاطین کو اپنا گرویدہ بنالیتا تھا۔

شیخ جمالی کے نام میں کافی اختلاف ہے بعض مورخین نے جلال خاں نام اور جلالی تخلص تحریر کیا ہے اور بعض شیخ فضل اللہ نام اور جمالی تصنیف کرتے ہیں،لیکن ڈاکٹر محمد ریاض،ڈاکٹر صدیق شبلی اور خود جمالی کی کتاب شیر العارفین سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ان کا نام ''حامد بن فضل اللہ جمالی'' ہے پہلے ''جلالی'' تخلص کرتے تھے لیکن پھر بعد میں اپنے مرشد شیخ سماء الدین کے حکم پر ''جمالی'' تخلص کرنے لگے۔ان کے نام سے متعلق سیر العارفین میں ایسی عبارت آئی ہے:

''معتقد اہل اللہ حامد بن فضل اللہ الراجی الی حضرت المتعالی
المعروف بدرویش جمالی''

وہ دہلی سے قریب پنجاب کے ایک قبیلے کنبوہ سے تعلق رکھتے تھے خاندان زراعت پیشہ ہونے کے ساتھ ساتھ ابتداء سے ہی دینی ودنیوی

تعلم میں ایک معزز مقام رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی دینی و دنیوی تعلیم میں سرفرازی حاصل کر کے اپنے وقت کے جانے مانے علما و صوفیا میں شامل ہوئے تھے۔ بہلول لودی کے عہد حکومت میں اس دنیائے بے ثبات میں پیدا ہوئے لیکن کب، کہاں ولادت ہوئی یہ کوئی تحقیقی دلائل سے ثابت نہیں ہوا ہے، دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے وہ دہلوی کہلائے۔

دونوں جہاں کی تعلیم و تربیت (سے سرشار ہو کر) حاصل کر کے سکندر لودی کے عہد حکومت میں مشہور ہوا، سکندر لودی پڑھا لکھا اور بہادر حکمراں تھا، علم و ادب میں دلچسپی رکھتا تھا شعر کہتا تھا گل رخ'' تخلص اختیار کیا تھا ،شعراء علماء کی قدر کرتا اس کے زمانے میں علمی، عرفانی محفلیں پھر سے سجنے لگی باہر سے آنے والے عالم و فاضل کی حوصلہ افزائی و عزت کی جانے لگی، درباری زبان ''فارسی'' میں مروج کی جس کی وجہ سے یہاں کے ہندو بھی فارسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔

جمالی اور سکندر کے تعلقات اچھے تھے جس کو خود جمالی نے اپنے تعلقات، اس کی فطرت، مزاج کو سیر العارفین میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

''تصنیف این کتاب معتقد اہل اللہ جمالی فضل اللہ وقتی کہ حضرت سلطان سکندر طاب ثراہ جل الجشہ مشواہ'' دعوت اجل را اجابت نمود دبجوار رحمت حق پیوست پسر بزرگ، سلطان ابراہیم سریر سلطنت جلوس یافت، سلطان سکندر مذکور بادشاہِ بااخلاق حمیدہ آراستہ و باوصاف پسندیدہ پیراستہ طبعش بعنایت لطیف بود بیشتری اشتغال بشعر گفتن می نمود بارباب فلاح اتحادش بیحد بود و اصحاب صلاح اعتقادش بیعد علی الخصوص باین درویش محبت و مودت از دیگران پیش داشت''

اس دینی و دنیوی تعلیم میں مکمل دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے جہاں بھی جاتا، کسی بھی سفر کے مہم پر کسی سے بھی ملتا اس سے برجستہ گفتگو کرتا اور اسی سبب سے اس کے تعلقات کسی بھی بڑے مشائخ، علما، فضلا، ادیب و شعرا سے استوار ہو جاتے انھوں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا، جیسے ملتان، یمن، بغداد، روم، شام، عراق، عرب و عجم، بیت المقدس خانہ کعبہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے بھی مستفید ہوئے ہیں، والد کا سایہ عہد طفلی میں اٹھ جانے کے باوجود اپنی استعداد و لیاقت سے رسمی و روحانی تعلیم میں قدر و منزلت حاصل کی ان کے تعلیم سے گہرا رجحان و دلچسپی کی بنا پر سفر کے دوران شہاب الدین سہروردی کے ہم نشین سے جب ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان کو ''عوارف المعارف'' کا وہ نسخہ ان کو دیا جس کا ذکریا ملتانیؒ نے مطالعہ کیا تھا۔

مزاج میں بے ساختگی، بیبا کی بے خوفی تھی، اور حاضر جوابی میں ان کی کوئی مثال نہیں تھی، جامی سے تبریز میں ان کی ملاقات ہوئی تو ان کو بھی بے ساختہ جواب دیے۔

شیخ عبدالحق ان کی کیفیت وطبیعت کو اخبار الاخیار میں بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کی ہے جو اس طرح ہے:

''مہارت صورت و معنی در ذات او تعبیر یافتہ بود در محافل و ارتکاب عزائم امور بہ غایت دلیر بود، کمتر کسی را از اکابر در مجلس فرصت سخن دادی۔''

وہ ابھی مدرس کے مقام پر فائز نہیں ہوئے تھے کہ ان کے اندر روحانیت کی تڑپ جاگ اٹھی جمالی سہروردی سلسلے سے وابستہ تھے، جب شہاب الدین سہروردی کے سجادہ نشین سے بغداد میں ملاقات ہوئی تھی تو اپنے سہروردی ہونے کا اظہار خیال ظاہر کیا تھا، سہروردی سلسلے کے عظیم بزرگ بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ سے انھیں بہت گہری عقیدت تھی، اور خود ان کے مرشد شیخ سماؤالدینؒ بھی سہروردی سلسلے کے ہندوستان میں بڑے بزرگ گزرے ہیں، جو روحانی صفت میں ان کے قابل قدر استاد رہے ہیں، یہ وہی بزرگ ہیں جن کے کہنے پر انہوں نے اپنا تخلص ''جلالی سے جمالی'' منتخب کر لیا تھا،

شیخ سماؤالدینؒ سہروردیہ سلسلے کے مشتہر بزرگ کا وطن ملتان تھا لیکن اس کو ترک کر کے سلطان التمش کے عہد میں دہلی میں مقیم ہوئے، یہ جمالی کے خالو اور خسر تھے جمالی نے انہیں کے ہاتھ پر بیعت کی، انھیں پیر طریقت کے روبرو رہ کر روحانی و عرفانی، شریعت و طریقت کا رراستہ طے کر کے بلند مقام پر فائز ہوئے، انہوں نے اپنے مرشد کے شان میں متعدد قصیدہ تحریر کیے ہیں۔

وہ ان کے دربار میں حاضری کے بارے میں خود اپنی کتاب سیر العارفین میں اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''سالہا این حقیر ملازمت و خدمت آنحضرت می بود و بدیدۂ ظاہر و باطن معاینہ می نمود و روش و اخلاق آں مرشد آفاق حیرتم می افزود، این حقیر از نماز نیم شب تا اشراق از حضرت ایشان منفک نمی گشت، بکلوخ استنجا از بیرون شہر در سیدھا نہادہ بر سر کردہ می آوردہ و آب وضو نیز مہیا می داشت و بدست مبارک ایشاں می ریخت''

وہ اپنے مرشد کے مجلس کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے اپنے پیر و مرشد کے محفل سے مستفید ہونے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے، اور خود ان کے مرشد بھی ان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

شیخ سماؤالدین سہروردیؒ کی وفات کے وقت وہ ان کے یہاں ہی موجود تھے، جب انھوں نے اپنے بیٹے سے ملاقات کی خواہش میں ذیل کا شعر لکھ کر اپنے ہر دل عزیز مرید کو دیا تھا جو انھوں نے اپنی تصنیف سیر العارفین میں تحریر کیا ہے:

طاقت وصبر مرانیست برین هجر طویل
قدمی زود بنه برسر این پیر عامل

''اما، ناگہان جمال رااز حرکت باز داشت موقع رحلت اواز این دارفانی فرارسید بود واونمی خواست جمالی از جنازہ اودور بماند''

جمالی فطرتاً تنہائی پسند، نڈر، بے پروا، روحانی صفت شخص تھا، وہ بہلول لودی، سکندر لودی، ابراہیم لودی، ہمایوں و بابر کے دربار سے وابستہ رہے لیکن کبھی ان کے ذہن میں بلند و پست کا خیال نہیں آیا، ان کو ان حکمرانوں کے دور حکومت میں دوستی وتعلقات میں برابر کے سلوک رہے ہیں بابر و ہمایوں سے تعلقات حسن اخلاق کے تھے جس کا ذکر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب اخبار الاخیار اور امین رازی نے اپنے تذکرہ ہفت اقلیم میں ذکر کیا ہے جس کو ذیل میں تحریر کرتے ہیں

''جنت آشیانی ہمایون بادشاہ رابہ صحبت شیخ ملی موفور بودہ وہموارہ بااومجلست می نمود واحیاناً بصحبتش می رسید''

ماثر الامرا میں ہمایوں اور جمالی کے تعلقات کو اس طور پر بیان کیا ہے کہ ہمایوں اس کے مکان پر بھی تشریف لے جاتے تھے۔ عبارت ذیل میں رقم ہے:

''با فردوس مکانی (بابر) مصاحب گشت واز جنت آشیانی (ہمایوں) تعظیم واحترام بسیار یافت، مکرر بادشاہ کلبہ، درویشانہ، اورابہ ورود خویش منور ساختہ''

ان کی جب وفات ہوئی تو وہ ہمایوں کے ساتھ گجرات میں قیام پزیر تھے، پھر وہاں سے ان کو دہلی میں لایا گیا اور وہیں تدفین ہوئی۔

جمالی نے اپنی تصنیف سیر العارفین ہمایوں کے نام معنون کی ہے، ان کو قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، نثری، تصنیفات پر مکمل دسترس تھی، مورخین اور تذکرہ نگاروں کے مطابق خسرو کے بعد ایک لمبے عرصے تک کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا تھا، اس طویل زمانے کے ختم ہونے کے بعد جب جمالی کی روحانی شاعری عوام وخواص کے سامنے نمایاں ہوئی تو محققین و نقادوں نے ان کو ''خسرو ثانی'' کا نام دیا، انھوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں ہیں جس کا ذیل میں مختصراً ذکر کریں گے، جو کہ حمد ونعت سے شروع ہو کر اپنے مرشد اور دیگر مشائخ واولیا کے احوال وشریعت وطریقت پر اختتام پزیر ہوئی ہیں۔

سیر العارفین۔ یہ تحریر عہد سلاطین کی چشتیہ وسہروردیہ سلسلے کے مشائخ وصوفیہ جو ہندو پاک میں قیام پزیر تھے کے حالات اور ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مستقل اور مستند تذکرہ ہے، اس میں بعض مشائخ کے احوال کے بارے میں پورے پورے ابواب دیے گئے ہیں اور کچھ کے بارے میں صرف ان مشائخوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ سیر العارفین کے تقریباً چھ خطی نسخہ مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے۔

مہر و ماہ:۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس کو تبریز کے حکمراں نے جمالی کو تبریز میں قیام کرنے کے دوران فارسی میں تحریر کرنے کا حکم دیا تھا، جس میں شہزادہ کا نام ماہ اور شہزادی کا نام مہر ہے، اس داستان کو اس نے بہت ہی خوبصورت انداز میں مثنوی کا جامہ پہنایا، جو کہ اس عہد کے ہندوستان کے موجودہ بادشاہ سکندر لودی کو بہت پسند آئی اور اس سے متاثر ہو کر انھوں نے شیخ جمالی کو اپنے ندیموں میں شامل کرلیا۔

مراۃ المعانی:۔ یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے۔ اس کے تقریباً تین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں۔

ماخذ

اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اردو، اشاعت، 2004
سیر الاولیاء، مترجم، مولانا اعجاز الحق قدوسی
خزانہ عامرہ، مصنف، غلام علی آزاد بلگرامی، اشاعت، 1900
گلزار ابرار، اردو اذکار ابرار، فضل احمد جیوری 1427ھ
مہر وماہ، مصنف، جمالی دہلوی، اشاعت 1974
سیر العارفین، مصنف، شیخ جمالی، مترجم محمد ایوب قادری، اشاعت، 1976
مراۃ المعانی، شیخ جمالی، اشاعت، 1384ھ

□□□

Akhtarun Nisa
Research Scholar
Dept. of Persian
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)
Mob: 9891023349
E-mail: Akhtarunn71@gmail.com

صدف پرویز

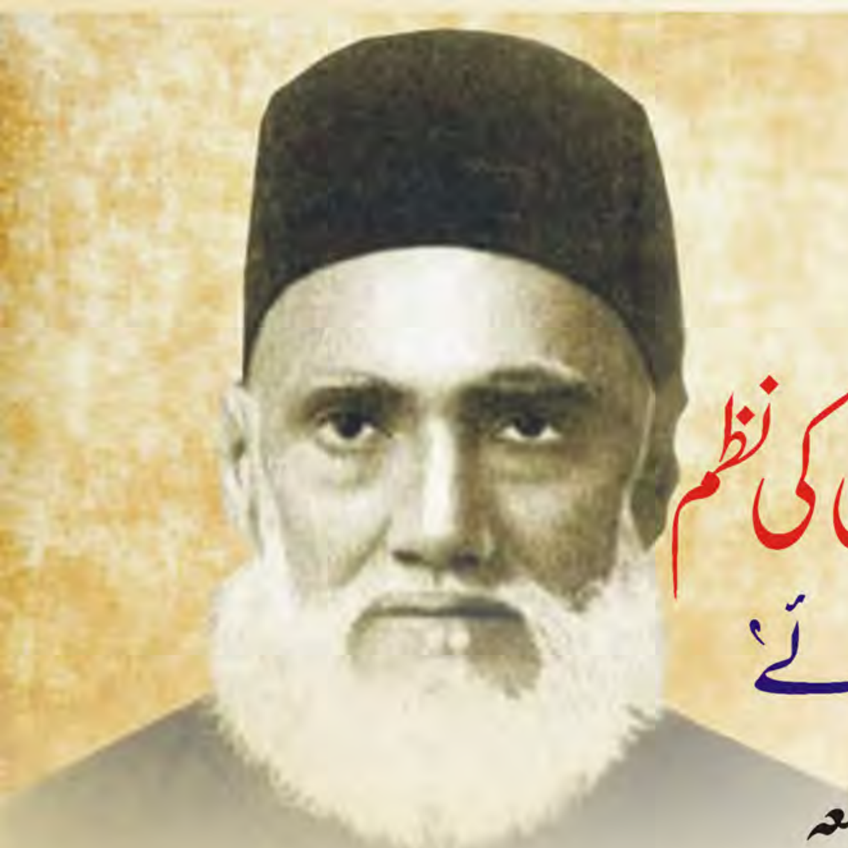

اسماعیل میرٹھی کی نظم ’میری گائے‘

ایک مطالعہ

اردو میں نظم گوئی کی تحریک میں اسماعیل میرٹھی کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے بچوں کے لیے اور مناظر فطرت پر مبنی جو نظمیں لکھی ہیں ان کی اہمیت آج بھی ہمارے لیے مسلم ہے۔اس مقالے میں اسماعیل میرٹھی کی ایک بے حد مشہور اور مقبول بچوں کی نظم ''ہماری گائے'' کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔یہ نظم ابتدا ہی سے بچوں کے اندر اپنے آس پاس کے ماحول اور اسے سمجھنے کے حوالے سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ابتدا ہی سے انسان کا تعلق ان جانوروں سے اتنا قریبی اور ناگزیر رہا ہے کہ معاشی اور ثقافتی حوالے سے ہم انسان، فطرت اور اس کے تمام مظاہر کے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا نقطۂ آغاز ان کے فطری رجحان اور ذہنی مناسبت کو مدنظر رکھ کر ہی کیا جاتا ہے۔جس سے آگے چل کر وہ ان ہی خطوط پر اپنی اخلاقی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کر سکیں۔نیز یہ کہ ان کے اندر بے زبان جانوروں، انسان کے تئیں ان کے جذبات، فطرت اور ماحول کے تئیں ایک منصفانہ اور ہمدردانہ جذبہ پیدا ہو سکے۔اسماعیل میرٹھی کی یہ نظم بے حد خوبصورتی کے ساتھ اس نصب العین کو پورا کرتی نظر آتی ہے۔اور بچوں کے معصوم جذبات کو بڑی ہی معصومیت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب بھی ہے

نظم کے پہلے چار اشعار اس طرح ہیں۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اردو زبان و ادب ہمیشہ سے ہی امن و یکجہتی کا پیغام دینے میں پیش پیش رہا ہے۔بظاہر بچوں کے لیے لکھی گئی اس نظم میں بھی ہمیں یہ خصوصیت صاف صاف واضح طور پر نظر آتی ہے کہ گائے کے اوپر نظم کا لکھنا، گائے کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام فوائد کا بیان، گائے کے بچے کا ذکر، گائے کی شکل و صورت کی معصومیت کا بیان اور ایسے دیگر لوازمات مل کر بچوں کے دل میں گائے کے لیے لا شعوری طور پر ایک مقدس جذبہ اور محبت کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں۔جس طرح سے اس نظم کو تحریر کیا گیا ہے اس سے گائے ہمارے گھر کی ایک فرد کی حیثیت سے نظر آتی ہے، نہ کہ محض کوئی کام چلانے والی بے جان شئے۔اس طرح یہ نظم بچپن ہی سے بچوں کے دل میں مذہبی رواداری

اور سیکولر جذبات پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بھی ہے۔ اس نظم کا تجزیہ ان ہی خطوط پر کیا جائے گا اور ساتھ ہی اسماعیل میرٹھی کے فن اور ان کی زبان کی ان خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جو اس نظم کا نشان امتیاز ہو۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اردو کی بچوں کے لیے لکھی ایسی تحریروں کو سامنے لایا جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے، جو مذہبی رواداری، سیکولر روایات، قومی یکجہتی، فطرت کے تئیں محبت اور انسیت وغیرہ کے عناصر رکھتی ہیں۔ اور اس امر کی شاید ہمیں آج جتنی ضرورت ہے اتنی پہلے نہ تھی۔ نظم اس طرح ہے۔

ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں
سبحان اللہ ' اب دودھ ہے کیسا!
تازہ، گرم، سفید اور میٹھا
دودھ، دہی اور مٹھا، مسکا
دے نہ خدا تو کس کے بس کا
دانا، دنکا، بھوسی، چوکر
کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
کھا کر تنکے اور ٹھیرے
دودھ ہے دیتی شام سویرے
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی ' جنگل کو سدھاری
سبزے سے میدان ہرا ہے
جھیل میں پانی صاف بھرا ہے
پانی موجیں مار رہا ہے
چرواہا چمکار رہا ہے
پانی پی کر چارا چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر
دوری میں جو دن ہے کاٹا
بچے کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت
دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اس کے بیل بنائے
جو کھیتی کے کام میں آئے
رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

نظم کے پہلے دو اشعار اس طرح ہیں۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں

نظم کی ابتدا اسماعیل میرٹھی ان انوکھے حمدیہ اشعار سے کرتے ہیں اور بندے کو (بچوں کو) اللہ تعالیٰ کا شکریہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس نے گائے جیسی مفید، کارآمد اور معصوم جانور انسانوں کی خدمت کے لیے پیدا کیا۔ ہمیں بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اسی کا نام لینا چاہیے کہ جس نے گائے کے ذریعہ ہمارے لیے دودھ کی دھارائیں بنائیں۔ جو ہمارے جسمانی اور ذہنی نشو و نما میں انتہائی سودمند ہیں۔ تیسرے اور چوتھے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں

ان اشعار میں وہ پھر پاک پروردگار کی نعمتوں اور صفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی اور خاک میں سبزہ اور گھاس پیدا کی جو کسی انسان کی بس کی بات نہیں۔ اسی گھاس یا سبزہ کو گھاس کھاتی ہے اور وہی گھاس یعنی گائے کی غذا گائے کے تھن میں دودھ بن کر تیار ہوتی ہے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اتنی سادہ اور دلنشین انداز میں اسماعیل میرٹھی نے بچوں اور ناپختہ ذہن میں ماحولیاتی توازن اور اس (Food cycle) کا نظریہ قائم کر دیا ہے۔ جس کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے۔ معصوم بچوں کے ذہن کو ہم سائنس کے فارمولوں کے ذریعہ اس کائنات کی تشکیل اور علت و معلول کے رشتے کو نہیں سمجھا سکتے۔ لہذا بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسماعیل میرٹھی نے کائنات اور فطرت کے توازن کا سائنسی نظریہ جس طرح شعری قالب میں ڈھالا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اگلے چار اشعار اس طرح ہیں۔

سبحان اللہ، دودھ ہے کیسا!
تازہ، گرم، سفید اور میٹھا
دودھ، دہی اور مٹھا، مسکا
دے نہ خدا تو کس کے بس کا؟
دانا، دنکا، بھوسی، چوکر
کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
کھا کر تنکے اور ٹھیرے
دودھ ہے دیتی شام سویرے

ان اشعار میں اسماعیل میرٹھی نے دودھ کی خوبیاں اور اسکی صفات بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کی ہیں۔ دودھ کو انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت قرار دیا گیا ہے۔ اور محاورتاً بھی کسی بھی ملک و معاشرے کی خوش حالی کا ذکر کرنے کے لیے یہی کہا جاتا ہے کہ اس کی حکومت میں تو

دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ جنت میں بھی دودھ کی نہریں بہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دودھ ہمارے لیے اللہ کے ذریعہ دی گئی بیش بہا نعمتوں میں سرفہرست ہے۔ اور ماہرین غذائیت نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کے لیے اور اس کے جسمانی اور ذہنی نشو ونما کے لیے دودھ کس قدر ضروری اور کس قدر ناگزیر شئے ہے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کی اس تازہ، گرم، سفید اور میٹھے دودھ، دہی، مٹھا اور گھی جیسی دوسری نعمتیں اس کے bye product کے طور پر تیار کی جاتی ہیں۔ اور یہ سب انسان کے بس کا کام نہیں۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر پانے پر قادر ہے۔ جس نے ہمارے لیے نعمتوں کا ایک خزانہ کھول رکھا ہے۔

اسماعیل میرٹھی ان اشعار میں بچوں کو ایک طرح کے صبر وقناعت کی تلقین کرتے ہیں ،لیکن یہ تلقین ایک نفسیاتی انداز میں کی گئی ہے۔ جو بچوں کے ذہن میں بڑے فطری انداز میں اخلاقی قدروں کے طور پر اتر جاتی ہے اور وہ اس کا احترام کرنا سیکھ جاتے ہیں یعنی دودھ جیسی بیش بہا نعمت اور قیمتی شئے، گائے کوئی قیمتی غذا کھا کر نہیں دیتی بلکہ وہ تو سوکھی روکھی چیزیں مثلاً دانہ، دنکا، بھوسی، چوکر کھا کر دیتی ہے۔ اس کی غذا میں تو تنکے اور ٹھیرے تک شامل ہیں۔ یعنی گائے ایک پرہیز گار اور قناعت پسند جانور ہے، کوئی درندہ نہیں اور اس قسم کی بظاہر معمولی غذا کے سہارے وہ نسلِ انسانی کو دودھ جیسا بیش قیمت سرمایا فراہم کرتی ہے، یہاں یہ بھی نقطہ قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں بنائی جس کی اہمیت نہ ہو۔ دانہ، دنکا، بھوسی اور تنکے جیسی چیزیں اتنی ہی اہم ہیں جتنی مرغن غذائیں۔ بات صرف اس قلب ماہیت کی ہے، جس تک انسان کی نظر نہیں جاتی۔ اسماعیل میرٹھی نے کتنی آسانی کے ساتھ ایک مشکل سبق بچوں کو ذہن نشین کروایا جو ان کی آگے کی اخلاقی تربیت اور انکی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں بے حد مستحکم ثابت ہو سکتی ہیں۔ آگے کے چار شعر اس طرح ہیں۔

کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی، جنگل کو سدھاری
سبزے سے میدان ہرا ہے
جھیل میں پانی صاف بھرا ہے
پانی موجیں مار رہا ہے
چرواہا چمکار رہا ہے
پانی پی کر چارا چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر

ان اشعار میں اسماعیل میرٹھی گائے کی فطرت اور اس کی عادات و اطوار پر روشنی ڈالتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ کیسا پیارا اور مسکین جانور ہے جو صبح ہوتے ہی اپنا فرض پورا کرنے کے لیے جنگل کا راستہ لیتا ہے جہاں اسکا سابقہ فطرت کے حسین مناظر سے ہوتا ہے۔ سارا میدان سبزے اور گھاس سے ہرا اور زرخیز نظر آتا ہے اور جھیل میں صاف شفاف پانی موجیں مار رہا ہے۔ چرواہا گائے کو پیار سے چمکارتا ہے۔ گائے چارا کھاتی ہے، پانی پیتی ہے اور گھوم پھر کر شام کو اپنے گھر واپس آتی ہے۔

یہ سارا منظر اتنی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ بچے تو بچے بڑوں کے دل پر بھی گویا نقش ہو جاتا ہے۔ یہ بچوں کو نہ صرف فطرت سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ یا ان کے دل میں فطری مظاہر کی خوبصورتی کا ایک احساس پیدا کرتا ہے بلکہ ان کے دل میں محنت اور فرض کی ادائیگی کے تئیں احترام کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے آگے کے اشعار اس طرح ہیں۔

دوری میں جو دن ہے کاٹا
بچے کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت
دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اس کے بیل بنائے
جو کھیتی کے کام میں آئے
رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

گھر آ کر گائے سب سے پہلے اپنے بچے کو پیار سے چاٹتی ہے جس سے کہ وہ دن بھر اپنے فرض کی ادائیگی کی وجہ سے دور رہی ہے۔ یہ منظر بھی ایک تصویر کی طرح بچوں کے دل پر نقش ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بالکل سچا اور قدرتی منظر ہے اور ماں کی مامتا کا ایک ناقابلِ فراموش مظہر بھی۔ اس منظر سے، بچوں کے دل میں ماں اور اس کی مامتا کی اہمیت پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہے اور وہ خود کو اس تمام صورتِ حال سے نیز اپنی ماں سے منسلک کر کے لاشعوری طور پر دیکھنا شروع کر سکتے ہیں۔ آگے چل کر اسماعیل میرٹھی گائے کو ہمارے حق میں ایک نعمت قرار دیتے ہیں جو کہ بنسپتی یعنی گھاس پھوس کھا کر ہمیں دودھ دیتی ہے۔ اس کے بچھڑے بڑے ہو کر مضبوط بیل بنتے ہیں جو اپنی جفاکشی، محنت اور لگن کی وجہ سے کھیتی کے کام میں بہت ہی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ آخر میں شاعر ایک بار پھر اپنے رب کی حمد وثنا کرنے کی تلقین کرتا ہے جس نے ہمارے لیے گائے جیسی معصوم، نیک، قناعت گزار، مضبوط، محنتی اور مفید و کارآمد شئے بنائی ہے۔

اس طرح ہم اس نظم میں دیکھتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی نے اس نظم

کے ذریعہ بچوں کے ذہن پر دو اثرات ایک ساتھ مرتسم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے یعنی ایک تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کا شکر بجالانے کا جذبہ اور دوسرا گائے کے لیے ایک انسیت اور احترام سے بھرا ہوا احساس ۔ساتھ ہی اس نظم میں وہ گائے کو بچوں کے لیے ایک آئیڈیل بنا کر پیش کرتے ہیں جس میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک شریف اور محنت کش انسان میں ہونا چاہیے ۔رحم ،ہمدردی ،محبت ،نیکی اور فرض شناسی کی مثال گائے کے ذریعے پیش کر کے اسماعیل میرٹھی نے بچوں کو بڑے نفسیاتی طریقے سے درندگی ،حملہ آوری ،بے رحمی ،نکمّے پن ،سخت گیری اور دوسری اسی قسم کی تمام برائیوں سے بچنے کی تلقین کی ہے۔اور اسکے ساتھ ہی انھوں نے بچوں کو کائناتی توازن (Ecological balance) جیسے ضروری اور اہم مگر قدرے مشکل سائنسی اصول کو بھی ان تک پہنچا دیا ہے۔اس کے علاوہ جیسا کہ اس مقالے کی ابتداء میں عرض کیا گیا تھا کہ یہ نظم اردو کے اس سیکولر روایت کی بھی امین ہے جو ابتداء تا حال اس کا امتیاز رہا ہے۔اور یہ سیکولر روایت آج ہمارے لیے جتنی اہم ہے اس کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔بچوں کے ذہن میں ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ نظم سیکولر اور اخلاقی اقدار کی بڑی بلا واسطہ مگر کامیاب نقش نفسیاتی طریقے سے مرتسم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کے ادب کے حوالے سے اسماعیل میرٹھی کی نظم ''ہماری گائے'' کی اہمیت ہمیشہ مسلّم رہے گی۔

□□□

Sadaf Parvez
M41A, Batla House
Jamia Nagar, New Delhi-25
Email Id: sadafparvez000@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.......................... بتاریخ..........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا
یہ قصر لا جواب بنا اور بگڑ گیا

چلتا نہیں ہے ابلق ایام ایک چال
اکثر یہ بد رکاب بنا اور بگڑ گیا

پارسا

بتا دیں ہم تمھارے کاکل شبگوں کو کیا سمجھے
سیہ بختی تھی اپنی یا اسے کالی بلا سمجھے

جدھر دیکھا اٹھا کر نیم بسمل کر دیا اس کو
تری مژگاں کو ہم سوفار پیکاں قضا سمجھے

ثریا

اخلاق سے تو اپنے واقف جہاں ہیگا
پر آپ کو غلط کچھ اب تم گمان ہیگا

یک لخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینے کو
پر کیا کروں کہ تیرا منھ درمیان ہیگا

چنداماہ لقا

اپنے ہاتھوں سے بگاڑا گیا گلشن اپنا
آپ بلبل نے جلایا ہے نشیمن اپنا

جھوٹ ہے سب کہ زمانہ ہوا دشمن اپنا
ہم نے تاراج کیا خود ہی نشیمن اپنا

انور فاطمہ شمیم

نقاب چہرۂ شب اٹھ چکا مگر پھر بھی
اداس اداس اجالے بجھی بجھی ہے سحر

جہان نو کا تصور حیات نو کا خیال
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے

زہرا نگاہ

جانے کس موڑ پہ کیا چوک ہوئی ہے مجھ سے
آرزو لا کے کہاں روٹھ گئی ہے مجھ سے

میں نے جو نقش ابھارا تھا وہ ایسا تو نہ تھا
میں نے شہکار جو ڈھالا تھا وہ ایسا تو نہ تھا

ادا جعفری

کوئی ہمیں بتلائے کس طرح جیا جائے
حالات زمانہ پر جب غور کیا جائے

ارباب خرد چپ ہیں ارباب جنوں حیراں
اس دور کے انسانوں کو کیا نام دیا جائے

جمیلہ بانو

وہ نکہت بہار ہوائے چمن میں ہے
اک جانفزا مہک سی مرے پیرہن میں ہے

ہر چند پر فضا ہے نیا راستہ حیات
کھینچے ہیں اپنی سمت پرانی ڈگر ہمیں

مسعودہ حیات

(آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، جنوری 1996، بھارت آفسیٹ پریس، گلی قاسم جان اسٹریٹ، دہلی)

حسرتیں

ڈاکٹر نسرین بیگم

مسٹر ایس بی شکلا گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھے۔ان کی دولڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔شکلا جی نے اپنے بچوں کوخوب پڑھایا لکھایا۔بڑی بیٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرکے والدین کے خواب کو پورا کیا۔شکلا جی کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ہماری بیٹی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے۔مگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کتنے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔۔۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کا بڑا خواب ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس ڈگری کو حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔شکلا جی کی بیٹی شالینی بھی بہت خوش تھی کہ اس کی محنت رنگ لائی۔۔۔

ایک طرف والدین کی یہ فکر بھی پریشان کررہی تھی کہ بیٹی کو اتنا پڑھا لکھا تو دیا شادی کے لیے اچھا لڑکا کہاں سے ملے گا۔کیونکہ آج کل تو لڑکے پڑھنے لکھنے میں دل ہی نہیں لگاتے۔جبکہ لڑکیاں خوب محنت سے پڑھتی ہیں۔

اور اگر کم پڑھے لکھے لڑکے کے ساتھ شادی ہوجائے تو کیا اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ انصاف ہوگا؟

اب تو لوگ یہ کہنے لگے کہ کیوں شکلا جی! لڑکی کے مستقبل کے بارے میں بھی تو سوچو!

کیا لڑکی کو پڑھاتے ہی رہوگے، ڈگری ہی اکٹھا کرواتے رہوگے یا شادی بھی کروگے۔عمر بڑھتی جارہی ہے۔لڑکی کی عمر بڑھ گئی تو رشتہ نہیں ملے گا۔

لڑکا کتنا بھی بڑا ہو، طلاق شدہ ہی کیوں نہ ہو اسے تو کم عمر کی ہی لڑکی چاہیے۔

بھئی! یہ ہمارا سماج ہے۔یہاں تو دوسرے کیا کہیں گے یہ تو سوچنا ہی پڑتا ہے۔ابھی لوگوں کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

ہر روز کے اس طرح کے سوالات سے شکلا جی تنگ آچکے تھے۔لوگوں سے کہنے لگے کہ کوئی اچھا رشتہ ہو تو شالینی کے لیے بتائیں۔

شکلا جی کو بیٹی کی شادی کی جلدی تو تھی کیوں کہ وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔شکلا جی سوچ رہے تھے کہ اسی سال شادی ہوجائے تو ہمیں سکون ملے اور لوگوں کی ہر روز کی باتوں سے راحت ملے۔لوگ کہتے تو بہت کچھ ہیں مگر مدد کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

آج کل رشتہ لگانے کی جگہ جگہ دکانیں کھل گئی ہیں۔یہ ایک بڑا کاروبار بن گیا ہے اور یہ کاروبار خوب پھل پھول رہا ہے۔ایک لڑکی کی

پروفائل پچاس جگہ گھومتی ہے۔لڑکوں کی پروفائل تو کم ہوتی ہے۔۔۔انٹر نیٹ کا زمانہ ہے۔آن لائن سارے کام ہورہے ہیں۔لڑکیاں پڑھ لکھ کر نوکری بھی کرنے لگتی ہیں۔اپنے پیر پر کھڑا ہونا چاہتی ہیں۔

تعلیم یافتہ لڑکیوں کو پڑھے لکھے لڑکے نہیں ملتے۔۔۔آج سماج کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ لیے ہے۔

شکلا جی کو ایک رشتہ شالینی کے لیے مل گیا۔بات آگے بڑھی اور شالینی کو دیکھنے کے لوگ آئے۔ساتھ میں لڑکا بھی آیا۔پہلی ملاقات میں تو صرف صورت شکل ہی دیکھی جاسکتی ہے۔انسان کے کردار کا اندازہ تو بعد میں ہی ہوتا ہے۔لڑکے نے ایک لڑکی کو پسند کرلیا۔شکلا جی بہت خوش تھے۔لڑکا ڈاکٹر تھا۔اس وجہ سے وہ لڑکے والوں کی ہر بات ماننے کو تیار تھے۔شالینی بھی خوش تھی کہ اس کا ہونے والا شوہر ڈاکٹر ہے اور خوبصورت بھی ہے بلکہ ہم سے بھی کہیں زیادہ۔۔۔۔۔۔

شالینی دل ہی دل میں خوش ہورہی تھی کہ جب لوگ دیکھے گے تو یہی کہیں گے کہ ارے شالینی تیرا پتی تو بڑا اسندر ہے۔

"ہاں ! کیوں نہیں ۔گاڑی کا رنگ بھی تو نریندر نے ہی پسند کیا ہے ۔

شکلا جی نے اپنی ساری جمع پونجی شالینی کے جہیز میں لگا دی ۔ساتھ ہی لڑکے والوں کی تمام مانگوں کو پرا کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے ۔ جولائی کی دس تاریخ کی شام شالینی کی بارات آگئی۔ ہر طرف شہنائی کی آواز تھی گونج رہی تھی ، جو کانوں میں ایک الگ طرح کی خوشی کا پیغام دے رہی تھی ۔ہر طرف خوبصورت سجاوٹ ... پھولوں سے منڈپ سجا ہوا تھا ...ہر طرف خوشی کا ماحول تھا...."

اور ڈاکٹر ہے۔

شالینی نے اپنی سہیلیوں کو خوشی خوشی نریندر کی فوٹو دکھائی۔۔۔

سہیلیاں بولیں واقعی شالینی تیرا ہونے والا پتی تو بڑا اسمارٹ ہے۔۔۔۔۔

تیرے پتا نے دل لگا کر لڑکا ڈھونڈھا ہے۔ورنہ آج کل پڑھے لکھے لڑکے ملتے کہاں ہیں۔

شالینی کی سہیلیاں اسے چھیڑتیں رہتیں،مگر وہ برا نہیں مانتی تھی بلکہ اندر ہی اندر خوش ہوتی رہتی۔۔۔۔۔

شادی کی تاریخ تو طے ہوگئی تھی۔اب شادی کا دن بھی عنقریب تھا۔شکلا جی بیٹی کی شادی کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔وہ اتنے خوش تھے کہ میں تو اپنی بیٹی کی شادی میں اپنی پوری زندگی کی کمائی لگا دوں گا۔لڑکا ڈاکٹر ہے،جیسا میں چاہتا تھا ہمیں رشتہ بھی ویسا ہی مل گیا،ورنہ شالینی ڈاکٹر ہے۔اس کے لیے کم پڑھا لکھا لڑکا کیا اچھا لگتا۔

شکلا جی نے جہیز کا معقول انتظام کیا،جتنا وہ اپنی حیثیت کے مطابق کرسکتے تھے۔گھر کا سارا سامان اور گاڑی بھی۔

شکلا جی اپنی پتنی سے کہتے کیوں شیلا سن رہی ہو۔۔۔۔۔۔شالینی اور نریندر گاڑی میں بیٹھ کر کتنے اچھے لگیں گے۔

ہاں!کیوں نہیں۔گاڑی کا رنگ بھی تو نریندر نے ہی پسند کیا ہے۔

شکلا جی نے اپنی ساری جمع پونجی شالینی کے جہیز میں لگادی۔ساتھ ہی لڑکے والوں کی تمام مانگوں کو پرا کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔جولائی کی دس تاریخ کی شام شالینی کی بارات آگئی۔ہر طرف شہنائی کی آواز تھی گونج رہی تھی،جو کانوں میں ایک الگ طرح کی خوشی کا پیغام دے رہی تھی۔ہر طرف خوبصورت سجاوٹ۔۔۔پھولوں سے منڈپ سجا ہوا تھا۔۔۔ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔۔۔

شہر کے بڑے معتبر لوگ اس شادی میں جمع تھے۔گاڑیاں دور تک قطار میں کھڑی تھیں۔۔۔۔

مختلف قسم کے کھانے۔۔۔۔لوگ ایک دوسرے سے کھانے کی تعریف بھی کررہے تھے۔۔۔۔

شکلا جی کے یہاں یہ پہلی شادی تھی۔

اس لیے شکلا جی نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔۔۔بہت خوش تھے۔۔۔وہ اتنے خوش تھے کہ جیسے کوئی بڑی جنگ جیت رہے ہوں۔

ہاں!آج کل لڑکی کی شادی کرنا کسی جنگ جیتنے سے کم تو نہیں ہے۔

یہ حقیقت بھی ہے کہ والدین کے لیے سب سے بڑی خوشی کا دن یہی ہوتا ہے۔۔۔جس دن اس کی بیٹی کی شادی ہوتی ہے۔اس پر لڑکا اونچے عہدے والا ملے تو پھر کیا۔۔۔۔ماں باپ کی مانگی مراد پوری ہوگئی۔یوں تو ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی اچھے گھرانے میں ہو۔شریف لوگ ہوں۔ہماری بیٹی وہاں خوش رہے۔بس ہمیں اور کیا چاہیے۔

شکلا جی اس لیے خوش تھے کہ براتی شادی کے انتظام سے بہت خوش تھے۔شادی کی رسم پوری ہوتے ہوتے صبح ہوگئی اور رخصتی کی گھڑی آ گئی۔والدین بھائی ،بہن ،عزیز ، ملنے والے سب نے نم آنکھوں سے شالینی کورخصت کیا۔۔۔۔

اورسداخوش رہنے کا آشیرواد دینے لگے۔۔۔۔

سبھی کا آشیرواد لے کرشالینی سسرال پہنچ گئی۔۔۔

نریندراورشالینی بھی بہت خوش نظرآرہے تھے۔۔۔

ایک ہفتے کے بعد شالینی اپنے مائکے واپس آئی۔۔۔۔گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔شکلا جی نے بھگوان کا شکرادا کیا۔چلو ہماری جوخواہش تھی اسے بھگوان نے پورا کردیا۔ریٹائر ہونے سے پہلے شالینی کی شادی ہوگئی۔

دوبارہ جب نریندرشالینی کو لینے آیا تو شکلا جی سے کیش کی فرمائش کر گیا۔

مگر شکلا جی نے اسی وقت اپنی مجبوری کا اظہار کردیا کہ نریندراب ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ابھی ہمیں دوسری بیٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔۔۔

دوبارہ جب شالینی سسرال پہنچی تو اس نے نریندر کے اندر ایک الگ طرح کی تبدیلی دیکھی۔

وہ بہت پریشان ہورہی تھی اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر بات کیا ہے۔۔۔اچانک لوگوں کی نگاہوں میں فرق کیسے آگیا۔

وہ نریندرکو کچھ بھی دیتی وہ اس سے لینے سے انکار کردیتا اور وہی چیز وہ اپنی بہن اور ماں سے مانگتا۔۔۔

نریندر نے شالینی سے دوری بنالی۔یہ بات شالینی کے لیے بہت تکلیف دہ اورافسردہ کرنے والی تھی۔

مگر یہ سب کچھ وہ شالینی کو نیچا دکھانے کے لیے کرتا تھا۔

شالینی حیران تھی کہ آخراس سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے۔جس کی سزا پورے گھر والے اسے دے رہے ہیں۔گھر کے اس ماحول سے شالینی اداس اور خاموش رہنے لگی۔دنیا کا مبہم فلسفہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔وہ سراپا ہمہ تن ہوکراپنی پیچیدہ تقدیر کی گتھیوں کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرنے میں مصروف رہتی۔۔۔۔عرصہ گزرتا گیا۔۔

اتنے عرصے میں کتنی بہاریں آئیں اور خزاں کی نظر ہوگئیں۔ گھٹانے کتنی مرتبہ بیقرار ہوہوکراس کے غم میں سیاہ ماتمی لباس پہنا اور آخر کار روز روشن کی جلوہ آرائیوں میں فنا ہوگئیں۔۔۔۔مگر شالینی کی سوگوار حالت میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ غمزدہ رہنے لگی۔

بیٹی کا یہ حال شکلا جی سے نہ دیکھا گیا اور وہ شالینی کو گھر واپس لے آئے۔پتا جی کے پوچھنے پر شالینی نے ساری باتیں بتائیں کہ اس کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہورہا ہے۔

انھیں یہ سنتے ہی،پہلی بار میں ہی نریندر کی کیش کی فرمائش کی بات یاد آگئی۔۔۔انھیں یہ سوچنے میں دیر نہ لگی لگتا ہے اسی وجہ سے یہ تبدیلی نظر آرہی ہے۔

ان کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔۔۔۔

شالینی کے ساتھ ایسا سلوک اسی وجہ سے ہورہا ہے۔

اچانک ایک روز پولس شکلا جی کے گھر آئی۔۔۔شکلا جی پولس والوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔۔۔۔

ارے آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔آپ کسی غلط جگہ آگئے ہیں۔۔۔

نہیں۔۔۔ایس بی شکلا جی آپ ہی ہیں۔۔۔۔ہاں نام تو ہمارا ہی ہے۔۔۔مگر مگر۔۔۔یہاں،آپ کیوں اور کیسے؟

ڈاکٹر شالینی آپ کی بیٹی ہے۔۔۔جی ہاں !اس کی تو شادی ہوگئی ہے۔

اس کے سسرال والوں نے تھانے میں اس کے خلاف شکایت لکھوائی ہے۔

کیسی شکایت؟ آپ جلدی بتائیں۔

شکایت یہ ہے کہ ڈاکٹر شالینی سسرال سے بہت سارے زیورات چوری کرکے بھاگ کر آپ کے پاس آئی ہے۔۔۔۔

یہ سراسر جھوٹ ہے۔ایک ہفتے پہلے اس کا پتی نریندر اسے یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔

ہم کچھ نہیں جانتے،آپ تھانے پر آ کر بات کریں۔۔۔

شکلا جی یہ بات سن کر بہت غمزدہ ہوئے کہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد ہمیں اس کا یہ انجام ملا۔۔۔۔

شالینی کے سسرال والے تو بہت شریف لگ رہے تھے۔اسی لیے تو ہم نے وہاں شالینی کا رشتہ کیا۔

پولس دیکھ کر کالونی کے لوگ اکٹھا ہوگئے۔۔۔۔لوگوں نے کہا شکلا جی آپ خاموش نہ بیٹھیں نہ جانے وہ لوگ اور کیا کچھ نہ کر بیٹھیں۔

شالینی کے سسرال والے ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔۔آپ کورٹ کا سہارا لیں ،ورنہ جان بچانی مشکل ہوجائے گی۔ایک بیٹی کی شادی ابھی آپ کو اور کرنی ہے۔لڑکے والے کچھ بھی کریں۔لوگ لڑکی کو ہی بدنام

کرتے ہیں۔

پہلے تو وہ تھانے گئے ۔۔۔اور تھانے دار صاحب کے پاس اپنا بیان درج کروایا۔۔۔۔

تھانے دار صاحب نے کہا ہمیں شالینی کا بھی بیان لینا ہے۔۔۔

شالینی نے بھی اپنا بیان درج کروایا۔۔۔۔داروغہ جی ہم بے قصور ہیں۔۔۔۔بس ہمارا گناہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکی ہوں۔

ٹھیک ہے آپ لوگ جاسکتے ہیں۔

اگلے روز شکلا جی نے بھی مقدمہ درج کرادیا۔

"وہ سوچنے لگی کہ جھیز لیناتو جرم ھے ,لڑکے والے یہ جرم کھلے عام کرتے ھیں ان کا کچھ نھیں ھوتا ۔انھیں سزا نھیں ملتی اور مقدمہ برسوں عدالت میں چلتا رھتا ھے ....مگر انصاف ملتے ملتے بھت دیر ھو جاتی ھے ۔ یا انصاف ملتا ھی نھیں ۔

شالینی اداس تھی ...باقی تو سب کچھ پھلے جیسا ھی تھا ...کلیاں ابھی بھی مسکرا رھی تھیں ..مگر شالینی کی شگفتگی ختم ھو چکی تھی ۔"

اب شالینی کی قسمت کا فیصلہ عدالت میں ہوگا۔نہ جانے عدالت کب اور کیا فیصلہ سنائے۔۔۔۔

نہیں معلوم۔۔۔پتہ نہیں ۔۔نریندر اور اس کے گھر والوں کو اس گھناؤنی حرکت کی سزا ملے گی بھی یا نہیں۔

یا پھر شالینی گھٹ گھٹ کر جیتی رہے گی۔۔۔۔

وہ سوچنے لگی کہ جہیز لینا تو جرم ہے،لڑکے والے یہ جرم کھلے عام کرتے ہیں ان کا کچھ نہیں ہوتا۔انہیں سزا نہیں ملتی اور مقدمہ برسوں عدالت میں چلتا رہتا ہے۔۔۔۔مگر انصاف ملتے ملتے بہت دیر ہو جاتی ہے۔یا انصاف ملتا ہی نہیں۔

شالینی اداس تھی۔۔۔باقی تو سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔۔۔کلیاں ابھی بھی مسکرا رہی تھیں۔۔مگر شالینی کی شگفتگی ختم ہو چکی تھی۔

اس کی تازگی افسردگی میں بدل چکی تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور اس کے دامن کو بھگو رہے تھے۔وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی کا سودا ہو رہا ہے تو وہ شادی ہی نہ کرتی۔ مگر انسان کے تو اب دو چہرے ہونے لگے ہیں۔

روپیوں کے لالچ میں لوگ اندھے ہو گئے ہیں۔

شالینی سوچنے لگی کیا اس کے شادی نہ کرنے سے یہ جہیز کا بدنما داغ سماج سے مٹ سکتا ہے۔۔۔نہیں ہرگز نہیں۔

کیا لڑکے والوں کو اتنی آزادی ہے کہ وہ کھل کر بلا خوف جہیز مانگ سکیں۔اور جہیز نہ ملنے پر جیسا چاہے، جو جی چاہے کر سکیں؟

لڑکے والے کسی بھی لڑکی کی زندگی کو کھلونا سمجھ کر کھیلیں اور جب جی چاہے یا ان کی مانگ پوری نہ ہونے پر اس پر کوئی بھی الزام رکھ کر چھوڑ دیں ، پھینک دیں۔۔۔۔انھیں یہ آزادی کس نے دی ہے۔۔۔۔۔اگر اس مرض کو پھیلنے سے نہیں روکا گیا تو پڑھی لکھی لڑکیاں شادی کے نام سے ڈریں گی۔

ڈاکٹر شالینی چیخ چیخ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر جج صاحب سے کہہ رہی تھی۔۔۔۔

جج صاحب اس مرض کو پھیلنے سے روکیے۔۔۔آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔قانون؟

ایسے قانون سے کیا جو وقت پر انصاف ہی نہ دلا سکے۔

ایسے مجرم کو سخت سے سخت سزا دیجیے۔۔۔

تاکہ کوئی دوسرا ہمت نہ کر سکے۔۔۔۔کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے کی۔۔۔۔ساری زندگی سزا تو اسے بھگتنی پڑتی ہے۔۔۔

سماج میں ایک مجرم کی طرح اسے زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جج صاحب کیا فیصلہ دیں گے اور کب دیں گے۔۔۔در یہ سب کچھ کہتے کہتے شالینی خاموش ہو گئی۔۔۔۔

شالینی اپنے والدین کے ساتھ عدالت کے کمرے میں حیران بیٹھی در و دیوار کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

جج صاحب نے سنوائی کو اگلی تاریخ تک کے لیے ملتوی کر دیا۔۔۔

□□□

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Head Dept. of Urdu
Baikunthi Devi Girls (P.G) College
Agra-282001 (U.P)
nasreenbegum283@yahoo.com

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

پھانس

آج 15 فروری ہے۔ شادی کو پورے دو سال ہو گئے۔ وہ یادیں جنھیں ہم بھلانا چاہتے ہیں جب ذہن پر قبضہ جما لیتی ہیں تو سانسوں سے لپٹ جاتی ہیں۔ کیا یہ عجب نہیں کہ یادوں کے درد و کرب میں کبھی کمی نہیں آئی۔۔۔۔ درد تو آخر درد ہی ہوتے ہیں۔ کچھ یادیں، کچھ تاریخیں، کچھ دن کچھ لمحے ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی بھلائے نہیں جاتے۔

ثمینہ بہت دنوں بعد اس کمرے میں آئی تھی۔ حالانکہ یہاں پر سب کچھ بدل چکا تھا مگر وہ یادیں، وہ گزرے پل بھلائے نہیں بھولتے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ گھٹی گھٹی سانسوں کی آوازیں آج بھی کمرے میں موجود ہیں اور اس کے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔۔۔۔ اور پھر وہ یادیں ذہن کے پردوں سے مچل مچل کر ابھرنے لگیں۔ کتنے اذیت ناک تھے وہ لمحات۔

اچانک سے ثمینہ کی شادی طے ہو گئی تھی وہ بھی صرف دو دن میں۔۔۔۔ چار لوگوں میں نکاح ہوا تھا۔ بچپن سے ہی اس کی شادی ساجد سے طے تھی مگر اچانک امی نے فیصلہ سنایا کہ تمھاری شادی ساجد سے نہیں ماجد سے ہو رہی ہے اور وہ بھی دو دن بعد اور دو دن بعد بہت ہی سادگی سے نکاح کر کے اس گھر میں آئی تھی۔ ساجد اور ماجد ثمینہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ بچپن سے ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ ثمینہ پانچ سال کی تھی جب اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے اسی شہر میں ماں اپنی بہن کے قریب آ کر رہنے لگیں۔ ساجد کے ساتھ ہمیشہ ایک فاصلہ بنا رہا لیکن ماجد کے ساتھ اس کی بہت اچھی دوستی تھی۔ اچانک یہ سب کیوں ہوا وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ شادی کے بعد ثمینہ کی امی بھی اپنی بہن یعنی ثمینہ کی سسرال میں ہی رہنے لگی تھیں۔

اس دن ثمینہ امی کے کمرے میں بیٹھی تھی کہ اچانک اس نے پوچھا، ''امی آپ کو میری شادی اتنی جلد بازی میں کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ماجد کو اس شادی کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کوئی بھی رشتہ اگر مجبوری میں جڑے تو وہ زیادہ دن نہیں ٹکتا۔۔۔'' ثمینہ سر جھکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

''تو کیا اس فقیر ساحل سے بیاہ کرتی تمھارا۔۔۔ جس کے پاس رہنے کے لیے گھر بھی نہیں ہے۔''

''کیا۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟''

امی کا یہ روپ اس کے لیے نیا تھا۔۔۔ اس نے امی کو محبت اور پیار سے بات کرتے ہی دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ ان کا دھیما لہجہ اور محبت بھری مسکراہٹ اسے بہت پسند تھی۔

''امی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟؟''

"صحیح کہہ رہی ہوں میں۔۔۔۔میری برسوں کی محنت کو خاک میں ملانے چلی تھی۔۔۔۔۔اس ساحل سے شادی کر کے۔"

ثمینہ نے اپنی امی کو دیکھا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔۔۔

"میں ہمیشہ سے ہی تیری شادی ساجد سے کروانا چاہتی تھی۔۔۔۔لیکن تو نالائق نکلی اور اس ساحل پر عاشق ہو گی۔کئی سال لگے مجھے اس گھر میں آ کر رہنے کا خواب پورا کرنے میں۔۔۔۔"

اب بھی ثمینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا!!

یہ کیا کہہ رہی ہیں امی؟"میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔"

"تو سن میری بات!!! سالوں پرانی بات ہے۔میری پڑھائی پوری ہو چکی تھی اور شیرین کا آخری سال تھا۔ایک دن ایک رشتے دار نے اماں سے کہا تھا کہ شفیق خان کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہے۔میں نے ان سے آپ کی بیٹیوں کا ذکر کیا ہے۔اور وہ رشتہ ہمارے گھر آیا۔۔۔۔گھر میں بڑی میں تھی۔۔۔۔اور مجھے یقین تھا کہ میری شادی شفیق خان سے ہوگی۔۔۔۔لیکن جب ان کی والدہ ہمارے گھر آئی تو انھوں نے میرے بجائے شیرین کا رشتہ مانگا اور یہ بھی کہا کہ شفیق کی بھی یہی رائے ہے۔اس طرح میرے خوابوں کا محل ٹوٹ گیا۔۔۔اور شیرین بیاہ کر اس حویلی میں پہنچ گئی۔مجھے شیرین سے کوئی حسد نہیں تھی مگر میرے دل میں ایک خلش تھی جو گھر کر گئی۔۔۔۔اور یہ خلش آہستہ آہستہ زخم میں تبدیل ہو گئی۔پھر جب میرے لیے تیرے بابا کا رشتہ آیا تو وہ ایک معمولی ملازم تھے۔چھوٹے سے گھر میں بیاہ کر آ گئی۔مجھے ایسا لگا جیسے میرے ماں باپ نے مجھے بوجھ سمجھ کر باہر پھینک دیا ہو۔تیرے بابا نے میری ضد پر اس چھوٹے سے گھر کو بیچ کر اچھا فلیٹ لے لیا۔پھر میں نے بھی جاب کی اور تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے ایک دوکان خرید لی اور اسے کرائے پر چڑھایا۔جب تو پیدا ہوئی تو ساجد چار سال کا اور ماجد دو سال کا تھا۔تیرے بچپن ہی میں تیرے باپ کا انتقال ہو گیا۔میں عدت گزارنے کے بعد وہ شہر، اپنی نوکری چھوڑ کر۔۔۔۔گھر دکان بیچ کر اس شہر میں ایک چھوٹا سا گھر لے کے رہنے لگی۔باقی پیسے بینک میں رکھے تیری پڑھائی اور شادی کے لیے۔۔۔۔اور میں نے پھر جاب شروع کی۔۔۔۔کچھ سالوں تک جاب کی۔پھر شیریں نے ہی منع کر دیا کہ میں گھر میں رہوں۔جب اس شہر میں آئی اسی وقت میں نے سوچا کہ میں تجھے اس گھر کی بہو بنا کر بھیجوں گی۔۔۔۔میں اس گھر میں نہ جا سکی تو کیا۔ویسے تو میں نے بچپن میں ہی شیرین سے ساجد کے لیے تیرا رشتہ مانگ لیا تھا۔ہر وقت اس کو یاد دلاتی رہتی کہ تو ہی اس کی بڑی بہو بنے گی۔

سب کچھ ٹھیک تھا۔لیکن اچانک تو بیچ میں ساحل کو لے آئی۔۔۔۔مجھے لگا میں نے اتنے سال جو محنت کی ہے وہ مٹی میں مل جائے گی۔۔۔۔۔۔اور یہ مجھے کسی بھی حال میں منظور نہیں تھا۔۔۔۔مجھے میرے خواب کی تعبیر چاہیے تھی۔ایک بار تو اس گھر میں آنے سے رہ گئی تھی۔۔۔ مگر اس بار نہیں۔۔۔۔۔کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ ماجد مجھے اکیلا یہاں رہنے نہیں دے گا۔ماجد کو میں نے اپنے بچے جیسا پیار کیا وہ بھی اپنی خالہ امی سے بہت محبت کرتا تھا۔ساجد سے زیادہ ماجد میرے قبضے میں تھا۔۔۔۔۔۔میں نے تیرے اور ساحل کے بارے میں ماجد کو بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اب وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"امی!! نہیں۔۔۔۔۔نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔۔۔آپ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی ہیں۔"

ثمینہ کو ماجد کا دور دور رہنا۔۔۔۔لیکن اس کا خیال رکھنا۔۔۔اس سے دور رہنا مگر آس پاس ہونے کا احساس دلانا۔۔۔کیا وہ صرف اس لیے تھا کہ ماجد سمجھتے ہیں کہ میں حاملہ ہوں۔

"یا اللہ! کیسی ماں ہیں آپ؟؟" وہ زور سے چلائی۔

امی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ اس کی چیخ سن کر کوئی کمرے کی طرف نہ آئے۔

"یہ کون سا روپ ہے آپ کا امی؟؟

میں نے تو آپ کو محبت کرتا۔۔۔۔پیار لٹاتا ہوا پایا ہے۔۔۔آپ میرے لیے ایک دوست کی طرح تھیں۔۔۔۔۔کبھی بھی آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہے؟؟؟ اگر کسی بیٹی سے ایسی غلطی ہو جائے تو ماں پردہ رکھتی ہے۔ آپ ماں ہیں یا ڈائن؟ اگر مائیں آپ جیسی ہوں تو ماں کے نام پر دھبہ ہیں۔۔۔اتنا گندا الزام لگانے سے پہلے ایک بار تو سوچا ہوتا اپنی بیٹی کے بارے میں۔۔۔۔۔۔ کیا اثر پڑے گا میری زندگی پر۔۔۔۔۔۔کیا منہ دکھاؤں گی اپنے شوہر کو۔۔۔۔۔کیسے جیوں گی یہ کلنک لے کر۔۔۔۔۔۔۔میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا!! آپ جانتی تھیں کہ ساحل روبینہ کا بھائی تھا اور وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی بھابی بنوں۔۔۔۔روبینہ کے ساتھ ہی صرف تین یا چار بار ساحل سے ملی تھی۔۔۔۔سب جانتے ہوئے بھی آپ نے مجھ پر الزام لگایا۔۔۔"

روتے روتے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔۔۔۔

"آپ میری امی نہیں ہو سکتیں۔۔۔۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی اور اپنے کمرے میں آ کر رونے

لگی۔ ماجد اسی وقت کمرے میں داخل ہوا تو ثمینہ کو روتا ہوا پایا۔

''ثمینہ! کیا ہوا۔۔۔تم ٹھیک تو ہو نا؟ کیا ہوا ہے؟؟؟ کچھ تو بتاؤ؟؟ کیوں رو رہی ہو؟؟''

''ثمینہ کچھ نہیں بولی اور ماجد کے گلے لگ کر اور زاروقطار رونے لگی۔

''ماجد میرا اور ساحل کا کوئی رشتہ نہیں!!!''

ماجد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔۔۔۔۔اس نے ثمینہ کو پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔۔۔۔

''پہلے تم رونا بند کرو۔۔۔تمھاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔۔۔۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ماجد مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔'' اور روتے روتے ثمینہ نے ساری بات ماجد کو بتادی۔''

ماجد کی کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو ثمینہ؟؟؟''

''ہاں ماجد! سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔'' اس کا روتے روتے برا حال ہو رہا تھا۔

''رضیہ خالہ نے ایسے کیوں کیا؟ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کو بدکردار کہہ سکتی ہے؟''

''ماجد!! میں وہ بدنصیب ہوں جس کی ماں نے اسے بدکردار بنا کر تم سے زبردستی شادی کروائی۔۔۔۔ ماجد! یہی میں امی سے کہنے گئی تھی کہ کیوں آپ نے ماجد کو مجبور کیا شادی کے لیے۔''

''ثمینہ تم سے کس نے کہا کہ میں نے مجبور ہو کر شادی کی ہے۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو!!!! تم تو ہمیشہ کہتے تھے کہ ہے ایک لڑکی ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔''

''ہاں!! کہتا تھا۔۔۔ ماجد نے ثمینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔۔۔تم ہی وہ لڑکی تھی۔۔۔۔ تمھارے سوا کوئی نہیں میری زندگی میں۔۔۔ پتہ نہیں بچپن سے ساتھ رہتے رہتے تم سے کب محبت ہوگئی۔ تم وہ میری پاک محبت ہو۔۔۔''

تھوڑی دیر پہلے ثمینہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔۔۔۔ بدنصیب کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔اب اس وقت وہ اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی۔

''ثمینہ! تم رضیہ خالہ کو معاف کردو!!! ماں ہے وہ۔۔۔''

''ماں!!!! کیا ماں ایسی ہوتی ہے؟ ماں تو اپنے بچوں کی غلطیوں کو معاف کرتی ہے۔ ان کی ڈھال بنتی ہے۔۔۔ یہ کیسی ماں ہے ماجد؟''

''کیا انھیں برا بھلا کہہ کر انھیں نیچا دیکھا کر شرمندہ کر کے سب ٹھیک ہو جائے گا؟؟ نہیں نا؟ تو بات کو ختم کردو۔۔۔۔تمھاری حاملہ والی بات میرے اور ممی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔۔۔اور یہ میں خود ممی کو بتادوں گا کہ تمھارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔''

ماجد نے ثمینہ کو آرام کرنے کو کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ ثمینہ جا چکی تھی لیکن اس کی کہی ہوئی باتیں دماغ پر ضرب لگا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ماجد رضیہ کے کمرے میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اسے بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب انھوں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ وہ بھی ان سے ناراض تھا۔ ماجد ان کی طرف دیکھے بنا ہاتھ جوڑ کر بولا، ''ثمینہ نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ آپ نے یہ سب کیا ہے۔ آپ سے کہوں گا کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ میں نہیں چاہتا میری بیوی کسی کے سامنے رسوا ہو اور آپ کی عزت میں بھی کوئی کمی آئے۔۔۔۔''

وہ اپنی بات پوری کر کے غصے سے نکل گیا۔

رضیہ اپنی لالچ میں کس قدر اندھی ہوگئی تھی۔۔۔۔۔اسے لگا کہ اس کی برسوں کی محنت خاک میں مل جائے گی۔۔۔۔ جو انھیں کسی حال میں منظور نہیں تھا۔۔۔۔اپنی بازی کو دوسری بار ہاتھ سے جاتا دیکھ کر تلملا گئی اور بازی جیتنے کے لیے ایک کہانی بنا کر ماجد کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن آج ثمینہ کی باتوں نے انھیں اپنا اصلی چہرہ دکھا دیا۔ وہ صحیح میں ایک ماں کہلانے کے قابل نہیں تھی۔۔۔۔۔اپنی نفرت اور بدلے کی آگ نے کچھ انہیں سوچنے سمجھنے ہی نہ دیا۔۔۔ کہ ان کی بیٹی زندگی بھر اپنی شوہر کا سامنا کیسے کرے گی۔۔۔۔۔اپنی چھوٹی بہن شیرین کو کیا منہ دکھائے گی۔۔۔۔ سینے میں ٹیس اٹھ رہی تھی۔۔۔۔۔سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔وہ ثمینہ کو آواز دینا چاہ رہی تھی مگر آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔وہ ثمینہ سے اپنے کیے کی معافی مانگنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن زندگی نے مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور معافی مانگے۔

□□□

Syeda Tabassum Manzoor Nadkar
226/1807 Road No. 6
Motilal Nagar No. 1
Goregaon-400104 (W) Mumbai (M.S)
nadkartabassum@gmail.com

آرزو آج بھی معمول کے مُطابق صبح سویرے اُٹھ کر اپنی امّی کے ساتھ گھر کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتے ہوئے ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی جلدی سے تیار ہوگئی اور برقعہ زیبِ تن کیا، کاندھوں پر سے پیٹھ پر کتابوں کا بستہ لٹکاتے ہوئے چہرہ پر نقاب باندھا- اور خدا حافظ امّی کہتی ہوئی گھر سے نکل پڑی- یہ اُس کا روز کا معمول تھا- صبح آٹھ بجے آرزو اور نیلوفر ایک ساتھ کالج کے لیے نکل جاتیں دونوں بی- کام فائنل ائیر میں زیرِ تعلیم تھیں- پڑوس میں ہونے کی وجہ سے دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ بھی حاصل تھا- اِس پُرآشوب دور میں دونوں کا ساتھ جانا اُن کے گھر والوں کے لیے بھی اِطمینان بخش تھا-

شہروں میں ٹرافِک کی بھرمار تو ظاہر سی بات ہے- اِسکول اور کالج کے طالِب علموں کے علاوہ مرد اور عورتیں اپنی اپنی منزل کی جُستجو میں رواں دواں... بسیں کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں- لڑکیوں اور عورتوں کو مجبوراً مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر بسوں میں سفر کرنا پڑتا ہے- ایسے میں سبھی کو اپنی اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کی جلدی لگی رہتی ہے... آرزو اور نیلوفر کے روزانہ کے سفر کا ذریعہ بھی بس ہی تھی- آجکل امتحان قریب ہونے کی وجہ سے اِسپشیل کلاسَس بھی جاری تھیں اور آج اُنھیں کالج سے نکلتے ہوئے تقریباً شام کے پانچ بج چکے تھے- وہ دونوں جلدی سے بس پکڑ کر گھر پہنچنا چاہتی تھیں- بس تو اُنھیں مل گئی مگر وہی بے جا بھیڑ سے بھری ہوئی....

آج دیر بھی بہت ہو چکی تھی- کالج اور گھر کا فاصلہ ایک گھنٹے کا تھا- دوسری بس کے اِنتظار میں ٹھہرنے سے اور دیر ہو سکتی ہے- یہی سوچتے ہوئے اُسی بس میں اُنھیں سوار ہونا پڑا دونوں بڑی مُشکل سے بس میں چڑھنے میں تو کامیاب ہوگئیں مگر سواریوں کے بیچ خود کے لیے جگہ بنانے کی کوشش میں نیلوفر ایک طرف تو آرزو دوسری طرف ہوگئی- بس نکل پڑی لیکن انھیں ٹھہر

ٹھہرنے میں کافی دقت محسوس ہو رہی تھی بس کی درمیانی جگہ ویسے بھی تنگ ہوتی ہے اُس پر بے جا مسافروں کی قِطار الگ....

اُس کے دائیں بائیں لڑکے لڑکیاں سبھی ٹھہرے ہوئے تھے وہ درمیان میں جیسے پھنس سی گئی تھی- وہ خود کو بہت بے چین محسوس کر رہی تھی سبھی دھکا دھکی کھا رہے تھے... آرزو نے کھڑے ہونے کی کوشش مشکل سے ایک سیٹ کی پُشت کے سرے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر مظبوطی سے اُسے تھام رکھا تھا...

کچھ وقفہ بعد اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ہاتھ پر کسی نے ہاتھ رکھ

دیا ہے- اُس نے فوراً وہاں سے اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا- اُسے لگا وہ کوئی مضبوط مردانہ ہاتھ ہے جو اُس کے نازک سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے دبائے جا رہا ہے... آرزو نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ ہاتھ کس کا ہے- جو اُس کے ہاتھ کو دبا رہا ہے- جمِ غفیر اور اُس پر تنگ جگہ کی وجہ سے وہ سراغ پانے میں ناکام رہی آرزو کو بہت غصہ آرہا تھا اُس شیطان صِفت بدتمیز انسان پر.... کچھ دیر کی جدوجہد اور اپنی بے جا کوشش کے ساتھ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے میں کامیاب ہوگئی- مگر اِس کھینچا تانی میں اُس کے ہاتھ کی کانچ کی چوڑی ٹوٹ کر اُس کی کلائی میں چُبھ سی گئی تھی- پھر اپنی کلائی میں دھنسی چوڑی کو نکالنے اور درد کو برداشت کرنے میں اُس کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ہاتھ پر مرکوز ہوگئی....

پھر جیسے ہی اُسے اُس بدتمیز کا خیال آیا غُصّہ سے آگ بگولہ اپنی نظریں گھماتے ہوئے اُس بدتمیز کو ڈھونڈنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی کہ کاش میں اُسے پہچان لوں تو اُس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر کے ایسا سبق سکھاؤں کہ زندگی بھر یاد رکھے اور پھر کبھی ایسی نازیبا حرکت کسی کے ساتھ نہ کرے... مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہو پایا- جب تک آرزو نے سنبھل کر دیکھا تب تک اُس کے آس پاس کی بھیڑ کم ہو چکی تھی اور اِس درمیان ایک اِسٹاپ بھی گزر چکا تھا- ہوسکتا ہے وہ اُتر بھی گیا ہو اُس نے سوچا اب ٹھیک سے جانے بغیر کسی پر الزام لگانا بھی تو مہذب بات نہیں.... اور پھر اُسے مایوسی کے عالم میں ہی بس سے اُترنا پڑا....

جیسے ہی نیلوفر کی نظر آرزو کے ہاتھ پر پڑی وہ آرزو کی کلائی کو تھامتے ہوئے حیرت سے پوچھنے لگی" آرزو یہ کیا- تمھاری کلائی پر یہ زخم کیسا؟.. کیا ہوا یہ کیسے ہوگیا"؟..

پھر آرزو نے نیلوفر کو آج کی تلخ ترین رودادِ سفر سنادی... آرزو کی باتیں سن کر نیلوفر بھی غُصّہ سے بھڑک اُٹھی" آرزو یہ کیسے انسان ہوں گے جن میں اِنسانیت کا جذبہ ہی نہیں رہا- زندگی کی بھاگ دوڑ اور گہما گہمی میں ہم لڑکیاں اپنی اپنی ضروریات کی خاطر باہر نکلتی ہیں- تو ہمیں کمزور اور لاچار صنفِ نازک سمجھ کر اِس طرح کا فائدہ اُٹھایا جاتا ہے"!.

نیلوفر کی باتوں کو سُنتے ہوئے آرزو بھی کہنے لگی-

"ہاں نیلو میں بھی یہی سوچ رہی ہوں- اس طرح حیوانیت پر اتر آنے والوں کے دل اگر عورت کی عظمت سے معمور ہوتے تو آج اس دنیا میں عورت یوں پامال نہ ہوتی"!..

دونوں سہیلیاں آج کی اس غیر متوقع روداد سے ایک دم جذباتی ہوگئیں تھیں- غصّہ میں لال پیلی ہوتی ہوئیں باتوں میں دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کیسے گھر تک پہنچ گئیں-

آرزو نے جاتے ہی کتابوں کا بستہ ایک طرف رکھا اور اپنا نقاب اور برقعہ اُتارتے ہوئے فرش ہونے کے بعد سیدھا کچن میں چلی آئی جہاں پر اُس کی امی بیٹی کی آمد کو دیکھتے ہوئے چائے بنارہی تھیں- آرزو کے لیے چائے ناشتہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہنے لگیں چلو بیٹا کچھ کھالو اور چائے پی لو تھک گئی ہوں گی- آرزو کا ذہن آج کے واقعہ کو لے کر کچھ زیادہ ہی ماؤف سا ہوگیا تھا سر میں بہت بھاری پن محسوس ہورہا تھا اُسے چائے کی سخت ضرورت محسوس ہورہی تھی- اُس نے امّی کے ہاتھ سے پلیٹ لینے کے لیے جیسے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا امی کی نظر اُس کے ہاتھ کے زخم پر پڑ گئی- آرزو کی گوری سی نازک کلائی پر چھوٹا ہی سہی زخم کا نشان صاف نظر آرہا تھا- وہ ایک دم تڑپ اُٹھیں اور ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے" بیٹا آرزو یہ کیا تمھارے ہاتھ میں یہ چوٹ کیسی؟.. کیا ہوا یہ زخم کیسے ہوگیا بولو بیٹا؟.. اور چلو آؤ"!.. کہتے ہوئے چائے کی ٹرے خود ہی تھامے آرزو کو لے کر ہال میں چلی آئیں اور اُسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے پھر سے پوچھنے لگیں

اب بتاؤ بیٹا کیا ہوا- تمھاری کلائی میں یہ چوٹ کیسے آئی"؟...

آرزو جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی-" کچھ نہیں امی آپ اتنی پریشان کیوں ہورہی ہیں- وہ بس میں چڑھتے ہوئے کافی بھیڑ کی وجہ سے میری ہی چوڑی ٹوٹ کر چُبھ گئی تھی تو یہ ہلکا سا زخم ہوگیا"!..

"ارے بیٹا اِسے ہلکا سامت سمجھو- تمھیں نہیں پتہ کبھی کبھی زخموں کو لاپرواہی سے معمولی سمجھ کر چھوڑنا بھی ناسور بن سکتا ہے- تم چائے پی لو میں دوائی لاکر لگاتی ہوں"!- یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر جانے لگیں تو آرزو نے امی کا ہاتھ پکڑ کر اُنھیں روک لیا" امی آپ میرے پاس بیٹھیے تو سہی"! اور مسکراتے ہوئے کہنے لگیں" آپ ماں ہیں نہ اِس لیے اپنے بچوں کی تھوڑی سی بھی تکلیف پر بہت جلد پریشان ہوجاتی ہیں آپ بیٹھ کر پہلے میرے ساتھ چائے پیجیے پھر میں خود جاکر اِس پر مرہم لگالوں گی"!.

امی پھر سے پوچھنے لگیں" پکا لگالوں گی نا"؟..

آرزو نے اپنی امی سے لِپٹ کر یقین دِلایا" جی امی پکّا لگالوں گی"!- آپ فکر نہ کریں میں اِس کو ناسور بننے نہیں دوں گی"!- وہ کہے جارہی تھی اور مسکرائے جارہی تھی- اُسے اپنی امّی کے پیار پر بڑا پیار آرہا تھا... چائے پینے اور اپنی پیاری سی ماں کے پہلو میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اُس کے دل کو کچھ تسلی محسوس ہوئی....

پھر وہ اُٹھ کر کمرے میں چلی آئی مگر ابھی بھی اُس کی ذہنی اُلجھن کم نہیں ہو پائی تھی- اُس نے جان بوجھ کر اپنی امّی سے حقیقت کو چھپایا

تھا- کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اگر سچّائی بتادے گی تو اس کی ماں بے اِنتہا پریشان ہوجائیں گی اور اپنی لاڈلی کی فکر میں اُن کا دن کا چین اور راتوں کی نیند بھی اُڑ جائے گی- وہ اپنی ماں کو اُلجھن میں ڈال کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی.... یہی سب سوچتے ہوئے وہ فرسٹ ایڈ باکس سے مرہم نکالنے لگی- اچانک سے قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے اپنے بھائی کو پایا- ”بھیا آپ آ گئے“؟ احساس اپنی بہن کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھ کر پوچھنے لگا ”آرزو یہ فرسٹ ایڈ باکس لیے“؟..
آرزو اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگی ”بھیّا دراصل میرے ہاتھ میں چوٹ لگی ہے“!..

”.آرزو کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احساس پریشان ہوتے ہوئے اپنی بہن کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگا" چوٹ دِکھاؤ تو - کیسے لگ گئی؟" آرزو ایک لمحہ کے لیے چُپ سی ہو گئی پھر اُس نے سوچا اپنے بھائی کو سچائی بتانا ہی بہتر ہوگا- اُس نے اپنا ہاتھ دِکھاتے ہوئے بھیڑ سے بھری بس میں پیش آیا ہوا سارا واقعہ بیان کردیا.....وہ کہے جارہی تھی اور احساس بُت بنا اپنی بہن کے گُلابی رنگ کی چوڑیوں والے نازک سے ہاتھ اور زخمی کلائی کو دیکھے جارہا تھا....ایسا لگ رہا تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو-احساس کے چہرہ پر ایک رنگ آرہا تھا ایک رنگ جارہا تھا.... اُس کی نگاہوں کے تصور میں وہ گُلابی رنگ کی چوڑیوں والا خوبصورت ہاتھ بار بار گردش کر رہا تھا....“.

آرزو کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احساس پریشان ہوتے ہوئے اپنی بہن کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگا ”چوٹ دِکھاؤ تو - کیسے لگ گئی؟“ آرزو ایک لمحہ کے لیے چُپ سی ہوگئی پھر اُس نے سوچا اپنے بھائی کو سچائی بتانا ہی بہتر ہوگا- اُس نے اپنا ہاتھ دِکھاتے ہوئے بھیڑ سے بھری بس میں پیش آیا ہوا سارا واقعہ بیان کر دیا.....وہ کہے جارہی تھی اور احساس بُت بنا اپنی بہن کے گلابی رنگ کی چوڑیوں والے نازک سے ہاتھ اور زخمی کلائی کو دیکھے جارہا تھا.... ایسا لگ رہا تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو- احساس کے چہرہ پر ایک رنگ آرہا تھا ایک رنگ جارہا تھا.... اُس کی نگاہوں کے تصور میں وہ گلابی رنگ کی چوڑیوں والا خوبصورت ہاتھ بار بار گردش کر رہا تھا.... احساس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا- وہ ٹس سے مس نہ ہوسکا.... اور آرزو تھی کہ غصہ میں نہ جانے کیا کیا کہے جارہی تھی- ”بھیا میں نے بہت کوشش کی اُس بدتمیز کا چہرہ دیکھ لوں مگر افسوس کہ میں ناکام رہی- میرے اِردگرد کافی لوگ تھے- جگہ کی تنگی کی وجہ سے میں اُسے پہچان نہیں پائی کاش میں اُس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتی تو اُس کے منہ پر ضرور ایک طمانچہ رسید کر کے اُس کو ایسا سبق سکھاتی کہ وہ پھر کبھی کسی لڑکی کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر پاتا“! آرزو کی ایک ایک بات احساس کے بے حِس ضمیر پر خنجر بن کر وار کر رہی تھی اور اُس کا دل چھلنی ہوا جارہا تھا.....وہ اپنی بہن سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا- ندامت سے اپنا سر جھکائے ساکت سابُت بنا اپنی جگہ سے ہلے بغیر بیٹھے کا بیٹھا ہی رہ گیا.....
آرزو غصہ میں نہ جانے کیا کیا کہتی ہوئی مرہم لگانے کے بعد کمرے سے نکل کر چلی گئی.....

مگر احساس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین پھٹ گئی ہو اور وہ اُس کے اندر دھنستا چلا جارہا ہو.....اور ”وہ بے آواز تھپڑ“ جس کی آواز بھلے ہی کسی کو سنائی نہ دی ہو مگر احساس کے کانوں میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ درجنوں تھپڑوں کی گونج سنائی دے رہی تھی- جسے برداشت کرنا اُس کے لیے کافی محال ہو رہا تھا- اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اِس بے آواز تھپڑ کی گونج زندگی کے ہر موڑ پر اُس کا پیچھا کرے گی.....

احساس- اِس شدّتِ ندامت سے کیا تم کبھی پیچھا چھڑا پاؤ گے؟... یہ سوال اِس وقت اُس کا ضمیر چیخ چیخ کر اُس سے کیے جارہا تھا..!!!

□□□

Zakira Shabnam
C/O Riyaz Ahamad
R-S.Foot Wear.#No 192
M-G.Market.Robertsonpet
K-G-F.
Dist. Kolar-563122 (Karnataka)
Mobile-9916969954
E-mail-zakirashabnam@gmail.com

شاہین انجم شفی

غزلیں

رشتوں کا سلسلہ شکستہ ہو گیا ہے
زمیں ہم ہیں تو وہ آسماں ہو گیا ہے

جو درس اس سے ملا تھا مجھ کو
وہ درد بھی اب دوا ہو گیا ہے

اداسی نے ان کی ہمیں یہ بتایا
کہ ان سے کوئی بدگماں ہو گیا ہے

یاد جس کی ہے میرے دل میں سلامت
وہ بھی آج مجھ سے جدا ہو گیا ہے

انساں بھی جل کر بن جائے پھر
منزل کا سخت راستہ ہو گیا ہے

بھٹکتی ہے ہستی تو بھٹکے بلا سے
وہ تو سب کے لیے رہنما ہو گیا ہے

منزل کے دھوکے میں جب بھی چلا ہوں
میری منزل ہی خود راستہ ہو گیا ہے

درد کا نام لگی گر دوا ہوتا تو کیا ہوگا
تمھارے ساتھ بھی ایسا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا

چلو مانا ادا اس نے مُفا ہونے کی نہ سیکھی
مگر دل میرا رکھنے کو خفا ہوتا تو کیا ہوتا

میں قتل بنوں تمھارا دوستی کرنا اک بہانا تھا
تمھیں اس بات کا پہلے پتہ ہوتا تو کیا ہوتا

خوشی کے کھلتے دروازے غم کے کھلتے دریچے بھی
محبت کا میری ان کو گماں ہوتا تو کیا ہوتا

نہ یہ خاموشیاں ہوتیں نہ یہ مایوسیاں ہوتیں
وہ ہم سے بعد ملنے کے جدا ہوتا تو کیا ہوتا

نہ یہ رسوائیاں ہوتیں نہ میری جان یوں جاتی
خفا ہو ہم سے تم یہ پہلے بتا دیتے تو کیا ہوتا

Shaheen Anjum Shafi
Sultan Khan ji ka Bas
Sela Gate, Bali
Distt. Pali-306701 (Rajasthan)
Mob: 7023139821

غزلیں

سائرہ عظیم

یہ کیسے لوگ ہیں کیسی شرارت کر رہے ہیں
سروں کی کاٹ کر فصلیں محبت کر رہے ہیں

ہوس بڑھنے لگی کاروں کی دولت کی زیادہ
یہ ٹھیکیدار رشتوں میں تجارت کر رہے ہیں

کمی ماں باپ کی ہے یا کمی ماحول کی ہے
تبھی بھائی بھی بھائی سے بغاوت کر رہے ہیں

کیا تھا بستی والوں نے جنھیں بستی سے باہر
وہی اب اپنی بستی کی حفاظت کر رہے ہیں

مزاج اپنا عظیم اُن کو بدلنا ہی پڑے گا
چلو مانا وہ سب کچھ حسب عادت کر رہے ہیں

Saira Azeem
B-322 Gali No.5 Mandawali
Fazalpur
Delhi-110092
Mob: 9312340686
E-mail: rehmanexpressdaily@gmail.com

ڈاکٹر سیدہ تفسیر فاطمہ

روز کہتا ہے، مگر وقت پہ آتا ہی نہیں
اپنا وعدہ وہ کسی طرح نبھاتا ہی نہیں

اس نے مجروح کیا میرے محل کو لیکن
آہ کرتا نہیں دل شور مچاتا ہی نہیں

اس نے تنہا مجھے رونے کے لیے چھوڑ دیا
اتنا ظالم ہے کہ پل بھر کو ہنساتا ہی نہیں

دل کی تختی پہ جو تصویر بنائی اس نے
چاہتی ہوں میں مٹا دوں، وہ مٹاتا ہی نہیں

اس کی تحریر کی تفہیم بہت مشکل ہے
حاشیہ لکھتا ہے تفسیر بتاتا ہی نہیں

Dr. Syeda Tafsir Fatma
Mughalpura, Husainabad
Bhagalpur-812005 (Bihar)
Mob: 9835947693
E-mail: syedatafsirfatma@gmail.com

حکیم محمد اکبر

یرقان اور امراض طحال

یرقان۔کنول باؤ

اس مرض میں تمام بدن کا رنگ زرد یا سیاہ ہو جاتا ہے جس میں زرد رنگ ہوتا ہے۔اس کو ''یرقان اصفر'' اور جس میں سیاہ رنگت ہوتی ہے اسے ''یرقان اسود'' کہتے ہیں۔یرقان اصفرا کثر جگر اور پتّہ سے اور یرقان اسودا کثر تلّی سے پیدا ہوتا ہے۔ہر ایک قسم علاحدہ علاحدہ بیان کی جاتی ہے۔

1 یرقان اصفر:۔(بلحاظ سبب) یہ چودہ قسم کا ہوتا ہے (1) وہ جو کہ بحران کے روز واقع ہو۔اس کی علامت یہ ہے کہ صفراوی بخاروں میں بحران کے ایام میں پیدا ہوتا ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ زردی کے ظاہر ہونے کے وقت اگر طبیعت کمزور ہو اور مادہ کو کامل طور پر دفع کرنے سے عاجز ہو تو طبیعت کی امداد کریں۔ورنہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔مادہ کے ظاہر جلد کی طرف دفع کرنے کے واسطے طبیعت کی مدد اس طرح کر سکتے ہیں کہ مریض کو گرم پانی میں داخل کریں۔اور سکنجبین کو تنہا یا شیرۂ کاسنی کے ہمراہ پلائیں۔جبکہ طبیعت مادہ کو کامل طور پر ظاہر جلد کی طرف دفع کر دیتی ہے تو ظاہر جلد سے زردی خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔ورنہ جلد کو صاف کرنے والی دوا استعمال کریں۔

2 وہ جو کہ جگر کے سوءِ مزاج گرم سے پیدا ہوتا ہے۔اس کی علامت اور علاج سوءِ مزاج جگر کے بیان میں دیکھیں۔یہ قسم اکثر سونوخس (جوش خون کا بخار) کے ساتھ ہوتی ہے۔

3 وہ جو کہ مرارہ (پتہ) کے سوءِ مزاج گرم سے پیدا ہو۔اس کی علامت یہ ہے کہ دفعتہً پیدا ہوتا ہے۔اور پیشاب پہلے سفید اور بعد ازاں زرد ہو جاتا ہے۔اس کے بعد سیاہ اور غلیظ آنے لگتا ہے۔سوءِ مزاج جگر یا سدّۂ جگر کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔بھوک بدستور رہتی ہے۔

علاج:۔سکنجبین ہمراہ شیرۂ کاسنی پلائیں۔اور دیگر تدابیر جو گرمی جگر کے واسطے مفید ہیں استعمال میں لائیں۔اور تنقیہ کے واسطے جوشاندہ ہلیلہ زرد۔شاہترہ۔افتیمون۔آلو بخارا استعمال کریں۔

4 وہ جو کہ پتّہ کے متورم ہونے سے پیدا ہو جائے۔اس کی علامت یہ ہے کہ ہر وقت بخار رہے گا اور قے اور ابکائیاں آئیں گی۔زبان کھردری ہوگی۔اس کا علاج ورم جگر کے مانند کریں۔

5 وہ جو کہ تمام بدن اور رگوں کی گرمی سے پیدا ہوتا ہے۔اس کی علامت یہ ہے کہ بدن چھونے سے گرم معلوم ہوگا۔قبض رہے گا۔بدن پر پھنسیاں نکلیں گی اور خارش ہوگی اور گرمی کے تمام آثار پائے جائیں گے۔

علاج:اگر گرمی سادہ ہو تو تبرید (سردی پہنچانا) کافی ہے۔لیکن اگر مادی ہو تو ضرورت کے مطابق عام تنقیہ و تعدیل کریں۔بدن پر روغن بادام وغیرہ کے مانند تر روغن ملیں۔تری پہنچانے والا آب زن کرائیں۔

6 یرقان اصفر کی وہ قسم ہے جو مسامات کے بند ہونے سے واقع ہوتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ یرقان کے ظہور سے پہلے موسم گرما میں سفر کیا ہوگا۔ یا بدن پر گرد و غبار زیادہ پہنچا ہوگا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ حمام وغیرہ میں بنفشہ۔ اکلیل الملک۔ بابونہ۔ خطمی۔ سبوس۔ گندم کے جوشاندہ سے غسل کر کے مسامات کو کھولیں۔

7 وہ ہے جو کہ ورم جگر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا بیان گزر چکا۔

8 وہ ہے جو کہ سدّ ہ جگر سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کا بیان بھی ہو چکا۔

9 یرقان اصفر کی وہ قسم ہے جو زہریلے جانوروں کے کاٹنے یا زہریلی ادویہ کے کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ جو کچھ زہر کے مناسب ہو اس کے ذریعہ زہر کو دفع کریں۔ گرم زہروں کی صورت میں قرص کافور اور دیگر سرد ادویہ مفید ہیں۔ اور سرد زہروں کی صورت میں تریاق فاروق نافع ہے۔

10 وہ ہے جس میں مرارہ یعنی پتہ ضعیف ہو جاتا ہے۔ اور ضعف کی وجہ سے صفراء کو جگر سے جذب نہیں کرتا۔

اس سبب سے یرقان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ متلی اور قے صفراوی آئے گی۔ قبض رہے گا۔ پاخانہ رنگین یا کم رنگین آئے گا۔ اس کا علاج وہی ہے جو کہ ضعف جگر کا ہے۔

11 یرقان اصفر کی وہ قسم ہے جو کہ جگر اور پتہ کے مابین کی نالی میں سدّ ہ پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی علامت وہی ہے جو کہ ضعف مرارہ میں اوپر بیان ہوئی۔ نیز پاخانہ بتدریج سفید آئے گا۔ علاج سدّ ہ جگر کے مانند کریں۔

12 وہ ہے جو کہ پتہ اور آنتوں کے درمیان راستے میں سدہ پیدا ہونے سے واقع ہوتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ پاخانہ دفعۃً سفید آنے لگے گا اور قبض رہے گا۔ اس کا علاج بھی سدّ ہ کا کھولنا ہے۔ اور حقنہ کرنا بہت نافع ہے۔ اور ان ہر دو نوع سدّی میں مغز املتاس کرم کلہ کے پانی میں حل کر کے روغن بادام تلخ ملا کر پلانا نہایت مفید ہے۔

13 قسم وہ ہے جو کہ ان دونوں راستوں میں (جو اوپر بیان ہوئے) گوشت یا مسّوں کے پیدا ہونے سے ظہور میں آتی ہے۔ اس کی علامت بھی وہی ہے جو کہ قسم سدّی میں بیان ہوئی۔ یہ لاعلاج مرض ہے۔

14 وہ قسم ہے جو کہ قولنج بلغمی میں بلغم لزج (لیسدار بلغم) کے اس رگ کے منہ پر جمع ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ صفرا آنتوں پر گرتا ہے۔ اس کا علاج قولنج کا دور کرنا ہے۔

تنبیہ:۔ سبب کو دور کرنے کے بعد آنکھوں کی زردی دور کرنے کے واسطے پرانے سرکہ کا حمام میں استنشاق کریں۔ اور سرکہ۔ گلاب اور انار ترش کا پانی ملا کر آنکھ میں ٹپکائیں۔ اور جوشاندہ افتیمون سے غرغرہ کریں۔

(2) یرقان اسود:۔ اس کو یرقان سندھی بھی کہتے ہیں۔ یہ سات قسم کا ہوتا ہے۔

اوّل قسم۔ وہ ہے جو کہ امراض طحال میں بحران کے طریقہ پر طبیعت کے دفع کرنے سے واقع ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصل مرض خفیف ہو جاتا ہے۔

علاج:۔ اگر ضرورت ہو تو ان تدابیر سے جو یرقان اصفر میں بیان ہوئیں۔ طبیعت کی مدد کریں (تاکہ وہ قوت کے ساتھ مادہ کو باہر کی طرف دفع کر سکے) اور روغن بابونہ اور روغن شبت کی مالش بھی مفید ہے۔

دوسری قسم یرقان سندھی کی وہ ہے جو کہ جگر اور تلّی کے درمیانی راستے میں سدّ ہ پیدا ہونے سے واقع ہوتی ہے۔

تیسری قسم وہ ہے جو کہ تلّی اور فم معدہ کے درمیانی راستے میں سدّ ہ واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں قسموں کی علامت یہ ہے کہ یرقان آہستہ آہستہ پیدا ہوگا۔ جگر میں بوجھ محسوس ہوگا۔ اور اول قسم میں بھوک آہستہ آہستہ بند ہو جائے گی۔ اور دوسری قسم میں تلّی میں بوجھ کا محسوس ہونا اور بھوک کا یکبارگی ساکت ہو جانا لازمی ہے۔ دونوں قسم کا علاج یہ ہے کہ مسہلات اور مفتحات کے ذریعہ سدّ ہ کھولیں۔ باسلیق یا اسلیم کی فصد کھولنے سے بہت جلد آرام ہوتا ہے۔

چوتھی قسم وہ ہے جو کہ جگر کی شدت حرارت کے باعث خون کے محترق ہونے سے واقع ہوتی ہے۔ اس کی علامات و علاج سوء مزاج حار جگر کے مانند ہے۔

پانچویں قسم وہ ہے جو کہ طحال کے ضعف سے پیدا ہوتی ہے۔ خواہ طحال کی قوت جاذبہ ضعیف ہو۔ خواہ قوت ماسکہ۔ لیکن قوت جاذبہ کے ضعف کی علامت یہ ہے کہ بھوک ساکت اور آنکھ کی سفیدی مکدر ہو جائے گی۔ اور ضعف ماسکہ کی علامت یہ ہے کہ بدن میں سوداء کی زیادتی کے آثار محسوس ہونے کے باوجود قے اور اسہال میں سوداء خارج ہوگا۔ اس کا علاج طحال میں تلاش کریں۔

چھٹی قسم وہ ہے جو کہ ورم طحال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا بیان آئندہ کیا جائے گا۔

ساتویں قسم وہ ہے جو کہ جگر میں سوء مزاج سرد کی زیادتی سے پیدا

ہوتی ہے۔اس کا علاج جگر کے سوءمزاج میں دیکھیں۔

تنبیہ:۔ جبکہ یرقان زرد یرقان سیاہ کے ساتھ جمع ہوجائے تو تین روز کے وقفہ سے دونوں ہاتھ کی فصد کھولنی چاہیے۔اور صفرا و سوداء کو خارج کرنے والے جوشاندہ سے تلیین کریں۔اس کے بعد جس کا غلبہ ہو تعدیل اس کی رعایت زیادہ کریں اور جگر وطحال کی اصلاح کی کوشش کریں۔

سوءمزاج طحال

اگر سوءمزاج گرم ہو تو تلّی میں جلن محسوس ہوگی۔ پاخانہ پیشاب سُرخ مائل بہ سیاہی آئیں گے اور حرارت کے دیگر آثار پائے جائیں گے اور بھوک ساقط ہوجائے گی اور اگر سوءمزاج خشک ہو تو تلی میں سختی خون میں غلظت اور بدن میں دُبلا پن ظاہر ہوگا۔اور اگر سوءمزاج تر ہو تو بیمار تلّی کے مقام پر گرانی محسوس کرے گا۔بدن کا رنگ سیسہ کے مانند ہوجائے گا۔

علاج:۔سوءمزاج ساذج میں فقط تعدیل کافی ہے اور مادّی میں تنقیہ کے ساتھ تعدیل کرنا چاہیے۔جیسا کہ جگر میں بیان ہوچکا۔مگر اس جگہ لگانے والی دوائیں تلّی کے مقام پر لگائیں۔اور بائیں ہاتھ کی فصد کھولیں۔ یہ ادویہ تلّی کے سوءمزاج گرم میں نافع ہیں۔آب مکوئے سبز۔آب برگ بید، آب کشوث کو سکنجبین کے ہمراہ پلائیں۔ اور تلیین کے واسطے مطبوخ ہلیلہ، مغز املتاس دیں اور حرارت کی شدت کے وقت قرص کافور جس میں اسقولوقندریون ڈالا گیا ہو۔اور سوءمزاج سرد میں آب کرفس سکنجبین بزوری حار کے ہمراہ اور مثلث[1] نہار منہ پلائیں۔ نیز مولی کا پانی۔ تریاق اربعہ گلقند اور پوست بیخ کبر سکنجبین بزوری کے ہمراہ دیں۔

سوءمزاج خشک میں شربت بنفشہ اور ماءالجبن اور ان کے مانند جو چیز تری پہنچانے والی ہوں شرباً اور ضماداً استعمال کریں۔اگر سوءمزاج مادّی ہو تو پہلے فصد کریں اور سوداء کا مسہل دیں۔سوءمزاج رطب میں گل سرخ۔ بیخ کبر۔زراوند۔بالچھڑ۔لک مغسول۔زرشک باریک کوٹ چھان کر جھاؤ کے پانی میں گوندھ کر قرص بنا کر کھلائیں۔اور مجففات کا لیپ کریں۔تلیین کے واسطے حب ایارج استعمال کریں۔اور جبکہ مادہ مرکب ہو تو علاج بھی مرکب کریں۔اور جو چیز تلّی کے سوءمزاج سرد تر میں تنقیہ کے واسطے مقرر ہے وہ بیخ کبر ہے۔اس کے ہم وزن افتیمون کوٹ چھان کر شہد کے ہمراہ گوندھ کر بقدر سات ماشہ کھلائیں اور سوءمزاج سرد خشک کو جسائت اور غلظت طحال کہتے ہیں۔اس کا بیان علاحدہ آئے گا۔

ورم طحال

اگر ورم طحال گرم ہو تو تپ لازم ہوگا۔ پس اگر ورم خونی ہوگا تو چوتھے روز تپ شدید ہوجائے گا۔اگر ورم صفراوی ہوگا تو تیسرے روز بخار کی زیادتی ہوگی۔ علاوہ ازیں ہر ایک قسم کے دیگر اعراض بھی ظاہر ہوں گے۔ اور اگر ورم بلغمی ہو تو اسے بج الطحال کہتے ہیں اور اگر ورم سوداوی ہو تو اسے صلابت اور جساۃ الطحال کہتے ہیں۔رطوبت و یبوست کی علامات سوءمزاج میں بیان ہوچکیں۔

علاج:۔ جو خلط باعث ہو اس کے مطابق تنقیہ و تعدیل کریں۔ ورم گرم کی صورت میں جو کا آٹا۔ برگ جھاؤ اور برگ مکو سبز کے پانی میں گوندھ کر ضماد کریں۔اور ورم بلغمی کی حالت میں انگور کی لکڑی کی راکھ روغن گل کے ہمراہ ملا کر یا بکری کی مینگنی کی راکھ تین حصّہ بیخ کبر کی راکھ ایک حصّہ سرکہ میں ملا کر طلا کریں اور ورم سوداوی میں اشق سرکہ میں پگھلا کر یا سداب و پودینہ سرکہ میں گوندھ کر یا گیہوں کی بھوسی سرکہ میں جوش دے کر اور اس میں اشق ملا کر طلا کریں۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اگر جھاؤ کی

لکڑی سے برتن بنا کر اسی میں پانی پئیں اور اسی میں کھانا کھائیں تو چالیس روز میں ورم طحال تحلیل ہوجاتا ہے۔اور اگر پرسیادشان زوفائے خشک اور تخم سنبھالو ہم وزن کوٹ چھان کر شہد میں گوندھ کر روزانہ بقدر سات ماشہ کھلائیں۔ ورم طحال کے تحلیل کرنے کے لیے نہایت مفید ہے۔اسی طرح انجیر اور کبر سرکہ میں بھگو کر کھلانا مفید ہے۔ اگر مریض طحال روزانہ صبح کے وقت اپنا پیشاب تین مرتبہ ہتھیلی بھر پیئے تو نہایت مفید ہے۔اور اگر جساۃ الطحال یعنی ورم سوداوی میں سختی کو مرہموں سے نرم کرنے کے بعد بائیں اسیلم کی فصد کھولیں۔تو نہایت مفید ثابت ہوگا۔

تقیح الطحال

جاننا چاہیے کہ ورم طحال اکثر تحلیل ہوجاتا ہے اور گاہے سخت ہوجاتا ہے۔لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ پختہ ہو کر اس میں پیپ پڑ جائے۔ ورم طحال کے مادہ کے پیپ بن جانے کی علامت یہ ہے کہ چبھن کے ساتھ درد ہوگا پیشاب بدبودار آئے گا اور اس میں غیر طبعی اجسام خارج ہونے کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ پیپ معدہ میں گرے اور قے یا پاخانہ کے ذریعہ خارج ہو۔ جاننا چاہیے کہ طحال کی پیپ میلی ہوتی ہے۔اس کا علاج وہی ہے جو کہ دبیلہ کبد میں بیان ہوچکا۔اور مدرات کے استعمال میں مزاج کی رعایت ضرور رکھنی چاہیے۔اگر پیپ پڑنے کے بعد طحال میں سختی باقی رہے تو وہ ضماد استعمال کریں جو ورم سوداوی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہر حالت میں قابضات سے پرہیز کریں۔ اور جس وقت ورم صلب مزمن ہوجائے اور دوا سے آرام نہ ہو تو اس طریقہ سے داغ دیں کہ مقام طحال کی جلد کو صنارہ سے پکڑ کر اٹھالیں اور ایک لمبے لوہے کے اوزار سے جس کا سر دوشاخہ ہو داغ دیں اور ایک دوسرے کے قریب دو داغ اور دیں۔ تین مرتبہ چھ داغ ہوجائیں گے۔اگر ایسا آلہ بنایا جائے جس کے چھ سر ہوں تو ایک مرتبہ ہی داغ دیا جاسکتا ہے۔

ضعف طحال

جاننا چاہیے کہ اگر طحال کی قوت جاذبہ ضعیف ہو تو بھوک ساکت ہوجائے گی اور سوداوی امراض پیدا ہوں گے۔ اور اگر قوت ماسکہ ضعیف ہو تو اسہال و قے سوداوی آئیں گی۔اگر طحال کی قوت ہاضمہ ضعیف ہو تو بھوک زیادہ ہوجائے گی یا اسہال سوداوی آئیں گے۔ اور اگر قوت دافعہ ضعیف ہو تو طحال بڑی ہوجائے گی اور بھوک ساکت ہوجائے گی۔

علاج:۔تقویت کے واسطے افتین۔ بالچھڑ۔ جھاؤ۔قرومانا (کالی زیری) شگوفۂ اذخر۔ بیخ کبر۔گل سرخ اور گوگل کو کوٹ چھان کر جھاؤ یا سداب کے پانی میں گوندھیں اور سرکہ اضافہ کرکے ضماد لگائیں۔اس کے علاوہ طحال کو کھردرے کپڑے سے ملیں اور بغیر پچھنوں کے سینگیاں کھنچوائیں۔

سدّۂ طحال

اس کی علامت یہ ہے کہ طحال میں ثقل محسوس ہوگا۔اور ورم کی علامات نہیں پائی جائیں گی۔علاج وہی ہے جو کہ سدّۂ جگر میں بیان ہوچکا ہے۔اس جگہ زیادہ قوی ادویہ استعمال کرنی چاہئیں۔ سکنجبین بزوری اور قرص کبر نہایت مفید ہیں۔

نفخۃ الطحال۔طحال کا پھول جانا

یہ مرض طحال کی قوت ہاضمہ اور دافعہ کے ضعف سے پیدا ہوتا ہے۔
علاج:۔طحال کو قوت دیں اور سبوس گندم۔ باجرہ اور نمک کی پوٹلی بنا کر اس سے تکمید کریں۔ پودینہ اور سداب سرکہ اور شہد میں ملا کر ضماد لگائیں۔مقام طحال پر محاجم ناری (آگ کی سینگیاں) اور سفوف حُرف 1ء کھلائیں۔

حجارۃ الطحال۔طحال کی پتھری

اس کی علامت یہ ہے کہ پیشاب میں ریگ خارج ہوگی اور تلّی میں چبھن محسوس ہوگی اور دیگر اعضاء میں کسی قسم کا مرض نہیں ہوگا۔علاج:۔انجیر محلل سرکہ میں ڈالا ہوا کھلائیں اور ضماد کریں اور مدرات و کاسرات (توڑنے والی) جو گردہ و مثانہ کی پتھری کو توڑنے و خارج کرنے کے واسطے ہیں، استعمال کریں۔

(میزان الطب اُردو، حکیم محمد اکبر، سنہ اشاعت 1992، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو-ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अप्रैल – २०२४ वर्ष: ८, अंक: ४
Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2024 ,Vol. 8, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-04-2024
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025